Phone : 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1963ء

حضور رسالتمآب ؐ نے فرمایا

کہ

جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور
وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ
اسکی ضروریات اور احتیاجات کیطرف سے لاپرواہی برتیگا ۔ (ابوداؤد)

تفصیل اس اجمال کی طلوعِ اسلام کے آئندہ شمارہ میں دیکھئے جو بتقریب سعید
جشن عید میلادالنبی ؐ انتہائی جذب و عقیدت کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے ۔

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

بدل اشتراک
پاک ہند سے سالانہ (۸) روپے
غیر ممالک سے سالانہ (۱۶) شلنگ

قیمت فی پرچہ
پاکستان و ہندوستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر (۸۰۰۰۸)
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵-بی- گلبرگ- لاہور

جلد ۱۶ | جولائی سنہ ۱۹۶۳ء | نمبر ۷

فہرست مضامین

لمعات ———— ۲
تجارت ———— (محترم عبدالرب صاحب) ———— ۱۲
انسان اور جنگ ———— (محترم پرویز صاحب) ———— ۱۷
حقائق و عبر ———— {(۱) مریم پاگل نہیں ہوئی (۲) علمائے ہند اور اسلامی مملکت (۳) جمعہ کی چھٹی (۴) ثقافتی اداروں کی امداد (۵) قومی ملکیت} ———— ۲۴
باب المراسلات ———— ۵۰
نقد و نظر ———— ۵۱
مسئلہ پاکستان ———— (ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب) ———— ۵۸
دنیا میں جنتی زندگی ———— (خان عبدالحکیم خان صاحب) ———— ۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

قرآن کریم کا پہلا ورق اُلٹیے۔ آپ کو انسانوں کے تین گروہ دکھائی دینگے — ایک دوسرے سے متمیز — ایک گروہ ان لوگوں کا جو خدا کی طرف سے متعین کردہ مستقل اقدار کی صداقتوں پر دل سے یقین رکھتے ہیں اور یقین کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنا ہر قدم انہی کے مطابق اٹھاتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو ان صداقتوں سے کھلے بندوں انکار کرتے ہیں۔ اور ان کے خلاف علی الاعلان دوسرے راستے پر چلتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ وہ ہیں جن کا ظاہر و باطن یکساں ہے جو اقرار کرتے ہیں تو دل سے اور انکار کرتے ہیں تو بھی دل سے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان دونوں گروہوں کا طرزِ عمل اپنا اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اول الذکر گروہ کے حصے میں اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں بھی آتی ہیں اور اس کے بعد کی دنیا کی خوش حالیاں اور سربلندیاں بھی۔ دوسرے گروہ کو دنیا کی آسائشیں اور آرائشیں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۔ (۲/۱۰۲) مستقبل کی زندگی میں ان کا کچھ حصہ نہیں ہوتا۔

لیکن ان کے علاوہ تیسرا گروہ ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ — (۲/۸) جو کہتے یہی ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ ایمان رکھتے نہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ وہ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۔ (۴/۱۴۵) ہیں یعنی جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں۔ آپ اس پر غور کیجئے۔ ذہن میں یوں آتا ہے کہ کفار کو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہونا چاہیئے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں! جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں کفار نہیں بلکہ منافقین ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی بدترین عذاب میں گزرتی ہے۔ یہ عذاب کس قسم کا ہوتا ہے اس کا اندازہ روزمرہ کی زندگی کی ایک ادنیٰ سی مثال سے لگایئے کسی ملازمت کے لئے اعلان شائع ہوتا ہے کہ امیدوار کے لئے گریجوایٹ ہونا ضروری ہے۔ ایک امیدوار فی الواقعہ گریجوایٹ ہے وہ ملازمت حاصل کر لیتا ہے اور اطمینان سے دن گزارتا ہے۔ دوسرا امیدوار گریجوایٹ نہیں۔ وہ اعلانیہ کہہ دیتا ہے

کہ میں گریجوایٹ نہیں، اسے ملازمت نہیں ملتی۔ لیکن اس کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اسے کسی قسم کی خلش اور تپش نہیں ستاتی۔ لیکن ایک تیسرا امیدوار ہے جو گریجوایٹ نہیں لیکن کہتا ہے کہ میں گریجوایٹ ہوں۔ اسے ملازمت تو مل جاتی ہے لیکن اس کے بعد اس کی زندگی جس مستقل عذاب میں مبتلا رہتی ہے وہ ظاہر ہے۔ وہ کسی رات بھی آرام کی نیند نہیں سو سکتا۔ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہ ایک ایک سے چور بنا رہتا ہے يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (۶۳/۴) کہیں پتا کھڑکا اور اس کی جان گئی کہ آئی ایک اور مصیبت۔ یہ اس زندگی میں جہنم کا وہ درکِ اسفل ہے جس سے وہ کبھی نکل ہی نہیں سکتا۔ آخرت کا عذاب اس سے الگ رہا۔

تشکیلِ پاکستان کے سلسلے میں ہمارے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوا۔ پاکستان کا مطالبہ اس بنیاد پر پیش کیا گیا تھا کہ ہم ایک ایسی آزاد مملکت چاہتے ہیں جس میں ہم خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کو عملاً نافذ کر سکیں اور ان کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس کا نام پاکستان کی آئیڈیالوجی تھا۔ کہنے والوں کو اپنے مطالبہ کی صداقت پر یقین تھا وہ جو کچھ زبان سے کہتے تھے ان کا دل اس کی گواہی دیتا تھا۔ ان کے برعکس، ایک گروہ اس آئیڈیالوجی کی صداقت سے انکار کرتا تھا وہ کھلے بندوں کہتا تھا کہ مذہب کو مملکت سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہب کا دائرہ اپنا ہے اور مملکت کا اپنا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں سیکولر انداز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

انگریز چلا گیا۔ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اس کا ایک حصہ پاکستان بن گیا۔ دوسرا بھارت۔ سیکولر انداز کی حکومت قائم کرنے کے مدعیوں کا ملک وہ تھا۔ اسلامی آئیڈیالوجی کے مطابق مملکت کی تشکیل کرنے کے دعویداروں کا وطن یہ۔ اس ملک کے رہنے والے جو کچھ کہتے تھے اس پر انہیں یقین تھا اور وہ سمجھتے بھی تھے کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ وہ بیٹھے اور چند دنوں میں اپنے ملک کے لئے سیکولر انداز کا دستور مرتب کر کے اس کے مطابق حکومت چلانے لگے۔ اسلامی آئیڈیالوجی کے مقابلہ میں سیکولر نظامِ حکومت کی جو خرابیاں ہیں وہ اپنی جگہ پر مسلّم، لیکن وہ جو کچھ کہتے تھے اس کے مطابق چل تو نکلے۔ ان کے ہاں کہیں اس قسم کا سوال نہ اٹھا کہ سیکولر اندازِ حکومت کسے کہتے ہیں، کسی نے اعتراض نہ کیا کہ جو دستور بنایا گیا ہے وہ سیکولر نہیں ہے۔ وہ اپنے "کفر" میں سچے تھے اس کے نتائج مرتب ہونے شروع ہو گئے۔ مستقبل کی زندگی میں بے شک ان کا کوئی حصہ نہیں لیکن انہیں منافعِ عاجلہ تو حاصل ہو گئے۔ وہ جہاں سے چلے تھے آج اس مقام سے کہیں آگے ہیں۔

دوسری طرف ہم بھی اپنا آئین مرتب کرنے بیٹھے اور اس دعوے کے ساتھ بیٹھے کہ دنیا دیکھے گی کہ ہمارا آئین کس طرح بے مثل و بے نظیر ہے، اس لئے کہ یہ آئین اسلامی آئیڈیالوجی کا آئینہ دار ہو گا جس کی مثال کوئی انسان پیش نہیں کر سکتا۔ ہم آئین مرتب کرنے بیٹھ گئے اور دنیا اس کا انتظار کرنے لگ گئی۔ ایک برس گزر گیا۔ دو برس گزر گئے۔ حتیٰ کہ کئی برس گزر گئے اسلامی آئین کا مرتب ہونا تو ایک طرف، یہ بھی دریافت نہ ہو سکا کہ اسلامی آئین کہتے کسے ہیں؟ خدا خدا کر کے ایک خام سا نگارہ مرتب ہوا لیکن اس کا ذکر ہی سرتا سر ... نتیجہ یہ کہ وہ مجلسِ دستور ساز مع اس کے مسودۂ آئین کے ... غت ربود ہو گئی۔

پھر ایک اور اسمبلی وجود میں آئی اور ۱۹۵۶ء میں ایک نیا آئین مرتب ہوا۔ اس آئین کا ایک باب اسلامیات پر مشتمل تھا۔ اس باب میں کہا یہ گیا تھا کہ

(۱) ملک میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نافذ نہیں ہوگا۔ اور جملہ قوانین رفتہ رفتہ، کتاب وسنت کے مطابق بنائے جائیں گے۔

(۲) پرسنل لاز تمام مسلمہ فرقوں کے اپنے اپنے ہوں گے۔

اس "اسلامی آئین" کے سامنے آنے پر یہ بنیادی سوال اٹھا کہ "سنت" کی اصطلاح کو متعین کر دیا جائے تاکہ یہ طے کرنے میں کوئی دقت نہ رہے کہ فلاں قانون سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں ملک میں جو ہڑبونگ مچی اس سے یہ عقدہ کھلا کہ جس طرح ان حضرات کے ذہن میں "مسلمان" کا کوئی متعین تصور نہیں ——— یعنی یہ متعین طور پر بتا ہی نہیں سکتے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں ——— اسی طرح ان کے ذہن میں یہ نکتہ بھی واضح نہیں کہ قانون سازی کے سلسلے میں "سنت" کا مفہوم کیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک گروہ نے سنت کا جو مفہوم بتایا دوسرے گروہ نے یہ کہہ کر اس کی تردید کر دی کہ

(ان لوگوں کی یہ) مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے ——— ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس سے مزاحمت کریں گے اور سنت رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

(جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث)

وہ تو کہئے کہ خیر ہوئی اور اس آئین کے مطابق قانون سازی کی نوبت ہی نہ آئی اور یہ طے کرنے کے لئے کہ کوئی پیش نظر قانون "سنت" کے مطابق ہے یا نہیں، ان حضرات میں جو سر پھٹول ہوتی دنیا اس کا تماشا دیکھتی ——— اب بھی ہمارے مختلف فرقوں میں آئے دن جو کچھ ہوتا رہتا ہے وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ بہرحال قبل اس کے کہ اس آئین پر عملدرآمد کی نوبت آتی، یہ آئین بھی کالعدم قرار پا گیا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ۱۹۶۲ء کا آئین آیا۔ اس آئین میں مختلف فرقوں کی تخصیص اور ان کے پرسنل لاز کی تمیز نہیں کی گئی۔ کہا یہ گیا ہے کہ ملک کا کوئی قانون "اسلام" کے خلاف نہیں ہوگا۔ اب اس کی بھی مخالفت ہو رہی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ

دستور میں یہ کہا گیا ہے کہ اسلام کے خلاف کوئی قانون نہ ہونا چاہیے۔ سابق دستور میں "اسلام" کے بجائے "قرآن وسنت" استعمال کیا گیا تھا۔ اس دستور میں نہ صرف ایک جگہ بلکہ ہر جگہ قرآن وسنت کے الفاظ چھوڑ کر لفظ اسلام استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلام کے مسلم اور معتبر ماخذ سے اجتناب کر کے کوئی خاص اسلام یا اس کی کوئی خاص تعبیر نافذ کرنا پیش نظر ہے۔ ورنہ آخر کون سی معقول وجہ ہے کہ قرآن وسنت کی تصریح سے ہر جگہ دانستہ اجتناب کیا گیا ہے؟

(مودودی صاحب کی تقریر۔ بحوالہ ایشیا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۶۳ء)

چنانچہ اب اس آئین کو بدل کر ۱۹۵۶ء کے آئین کو دوبارہ لانے کی مہم جاری ہے۔ اس مہم میں خواجہ ناظم الدین صاحب چوہدری محمد علی صاحب اور مولانا مودودی صاحب پیش پیش ہیں۔ خواجہ صاحب اپنے وقت میں ملک کے بلند ترین اقتدار کے حامل رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے وزیر اعظم بھی رہے ہیں اور گورنر جنرل بھی۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ اس قدر اختیارات و اقتدارات کے مالک تھے تو انہوں نے ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے کیا کیا تھا؛ جو وہ دوبارہ ان اختیارات کے حصول میں، "اسلام کے احیار" کا راز بتا رہے ہیں۔ کیا وہ اتنا ارشاد فرمائیں گے کہ انہوں نے اس زمانے میں (یا اس کے بعد اب) اسلام کا کون سا متعین مفہوم پیش کیا ہے۔ کیا وہ یہ بتائیں گے کہ وہ جس قسم کا اسلام اس ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں اس کے متعین خطوط کیا ہیں؟ اور اس کی دلیل کیا کہ وہ خطوط فی الواقعہ اسلامی ہیں۔

چوہدری محمد علی صاحب، تشکیل پاکستان سے بھی پہلے، اقتدار کی بلند کرسی پر فائز ہو چکے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ایک عرصے تک سکریٹری جنرل کا منصب سنبھالے رہے جس میں زمام کار قریب قریب انہی کے ہاتھ میں تھی۔ پھر وہ وزیر بھی بنے اور وزیر اعظم بھی۔ کیا وہ ارشاد فرمائیں گے کہ انہوں نے اس قدر عرصہ دراز میں ملک میں اسلام نافذ کرنے کے لئے کیا کچھ کیا تھا؟ ان کا شاہکار ۱۹۵۶ء کا آئین بتایا جاتا ہے جسے دوبارہ نافذ کرنے کے لئے وہ اقتدار کی کرسی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، اس آئین کے امتیازی خطوط یہ تھے کہ مسلم فرقوں کا آئینی طور پر تحفظ کیا جائے۔ پرسنل لاز، ہر فرقے کے الگ الگ ہوں اور ملک کے قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں۔ کیا وہ یہ ارشاد فرمائیں گے کہ مسلمانوں میں فرقوں کا وجود کون سے اسلام کی رو سے جائز ہے؟ اور پرسنل اور پبلک لاز کے امتیاز کے لئے قرآن و سنت میں کون سی سند ہے؟ نیز کیا وہ یہ بھی بتائیں گے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں ان کے نزدیک "سنت" کا متعین مفہوم کیا ہے اور اس مفہوم کے مطابق "سنت" کہاں ملے گی؟ کیا وہ پہلے سے کہیں متعین طور پر موجود ہے یا اسے خود متعین کرنا پڑے گا۔ اگر وہ پہلے سے متعین شدہ موجود ہے تو کیا پاکستان کے تمام مسلمان اسے سنت تسلیم کرتے ہیں اور اگر اسے خود متعین کرنا ہوگا تو ایسا کرنے کا کون مجاز ہوگا!

باقی رہے مودودی صاحب، تو ان کے ہاں، اسلام۔ کتاب۔ سنت وغیرہ کی اس قدر متضاد تعبیرات ملتی ہیں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ کا)۔ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ انہوں نے اپنی اس تقریر میں خود قرآن و سنت کی جگہ "اسلام" کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے۔ چنانچہ جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے اس سے آگے ہے۔ "یہ کہنا کہ اسلام کے خلاف کوئی قانون نہیں ہونا چاہیے۔ ایک منفی بات ہے۔ ایک حکومت جس کو وہ لوگ چلا رہے ہوں جو خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہوں محض اس بات کی پابند نہیں ہوتی کہ اسلام کے خلاف کام نہ کرے بلکہ وہ اس کی بھی پابند ہوتی ہے کہ اسلامی احکام کو نافذ کرے۔ جن چیزوں کو اسلام حرام کرتا ہے ان کو روکے اور انسانیت کی اصلاح کے لئے جو اسکیم اسلام نے دی ہے اسے عمل میں لائے۔" آپ دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں کس انتشار فکر و نظر کی غمازی کرتی ہیں۔

کہ ان سے اسلامی حکومت کا خواب پریشان سے پریشان تر ہو جاتا ہے۔ ان کا "اسلام" ان کی مصلحتوں کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ وہ آئین میں "اسلام کی جگہ" "قرآن و سنّت" کے الفاظ رکھنا چاہتے ہیں اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ "سنّت" کا جو مفہوم وہ پیش کرتے ہیں، اہل حدیث حضرات اسے سنّت کے خلاف ہوائی گھڑے قرار دیتے ہیں اور سنّت کو ان حملوں سے بچانے کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ زور اس پر دیتے ہیں کہ آئین میں "کتاب و سنّت" کے الفاظ رکھے جائیں اور کہتے یہ ہیں کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔ دوسری طرف وہ اس فقہ کو "مجموعہ شاذ تشنہ" قرار دیتے ہیں۔

یہ ہے جو کچھ اس بدقسمت ملک میں آئین سازی کے سلسلے میں گزشتہ سولہ برس سے ہو رہا ہے —— اور ہو رہا ہے ان لوگوں کی طرف سے من یقول آمنا باللہ وبالیوم الآخر۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یا تو ان حضرات کو معلوم ہی نہیں کہ اسلامی آئین کہتے کسے ہیں۔ اور اگر معلوم ہے تو اسے متعین طور پر پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ دونوں صورتوں میں ملک جس عذاب میں گرفتار ہے وہ ظاہر ہے۔ سولہ برس سے ملک کی دولت۔ وقت۔ توانائیاں ضائع ہو رہی ہیں اور اس کا ایک قدم بھی منزل مقصود کی طرف نہیں بڑھتا۔ کتنا عبرت انگیز ہے یہ نقشہ اور کیسی تاسف خیز ہے اس بدنصیب قوم کی یہ حالت! صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے عسکری انقلاب کے بعد قوم کو اس گرداب سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر (بالخصوص اپنے مشرقی وسطیٰ کے دورے میں) جو تقاریر کیں اور جو بیانات دئے، وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ ان سے قوم کی بڑی توقعات وابستہ ہو گئی تھیں اور لوگوں کے دل میں تابندہ اُمیدوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے لیکن معلوم نہیں کہ اس کے بعد حالات نے کیا پلٹا کھایا کہ ان کی وہ باتیں ماضی کی داستانیں بن کر رہ گئیں۔ حتیٰ کہ ان کا مرتب کردہ آئین بھی ان کے ان تصورات کا مظہر نہیں۔ انہوں نے حال ہی میں ایک جگہ کہا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ملک کو بغیر سیاسی پارٹیوں کے چلایا جائے (اور یہ چیز صحیح اسلام کے عین مطابق تھی) لیکن قوم نے اسے ناممکن بنا دیا۔ اس لئے میں نے شکست قبول کر لی اور مجبوراً ملک میں پارٹیاں بنانے کی بھی اجازت دیدی اور خود بھی ایک پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ بھی قوم کو صحیح منزل کی طرف لانے سے مایوس ہو گئے ہیں۔

یہ ہے وہ مقام جہاں یہ بدنصیب قوم اس وقت کھڑی ہے۔

حسرت پہ اس مسافرِ بے کس کی روئیے — جو تھک گیا ہو سامنے منزل کے بیٹھ کر

سوال یہ ہے کہ یہ صورت حالات کب تک گوارا کی جا سکتی ہے۔ جو قوم اپنے لئے قانون سازی کا اصول ہی متعین نہ کر سکے اس کی آزادی کس کام کی۔ آزادی حاصل ہی اس لئے کی جاتی ہے کہ قوم اپنی صوابدید کے مطابق اپنے لئے آزادانہ قوانین بنا سکے۔ ہمارے ہاں اس وقت تک کم و بیش وہی قوانین چلے آ رہے ہیں جو ہمیں انگریزی محکومی سے ترکہ میں ملے تھے۔ کیسا ان حالات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم سولہ برس سے آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں؟ اور بات اگر گزشتہ

سولہ برس ہی کی ہوتی تو بھی اسے برداشت کر لیا جاتا۔ لیکن ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ اگر ہم نے جرأت مندانہ طریق سے اس مسئلہ کو حل نہ کیا تو یہ سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا۔ موجودہ معیاروں کے مطابق (خواہ اس کے لئے "اسلام" کی اصطلاح استعمال کر لی جائے یا "کتاب و سنت" کی) آپ کوئی قانون ایسا نہیں بنا سکتے "جسے کوئی نہ کوئی فرقہ، خلافِ اسلام" یا خلافِ سنت قرار دے کر چیلنج نہ کرے ــــ اس لئے کہ "اسلام" بھی ہر فرقے کا الگ ہے اور "سنت" بھی ہر فرقہ کی الگ۔ اس وقت ملک کی ہر سیاسی پارٹی اور پارٹی کا ہر لیڈر آیندہ الیکشن کی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ الیکشن کی جنگ لڑنے کا بنیادی طریق یہ ہے کہ ہر پارٹی، دوسری پارٹی کو ہدفِ طعن و تشنیع بنائے ــــ جہنم کی زندگی کی قرآن کریم نے کیفیت ہی یہ بتائی ہے کہ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا۔ (۷/۳۸) اس میں ہر قوم اپنی ساتھی قوم پر لعنت کرے گی ــــ لیکن یہ بحران بالآخر ختم ہوگا۔ مجلسِ قانون ساز مرتب ہوگی۔ اسے قوانین بنانے ہوں گے ــــ مجلسِ قانون ساز کا اولین فریضہ ہوتا ہی یہ ہے کہ وہ ملک کے لئے قوانین مرتب کرے۔ کیا موجودہ لیڈروں میں سے کسی کو بھی اس کا خیال ہے کہ وہ قوانین کس طرح بنیں گے؟ خواجہ ناظم الدین صاحب فرماتے ہیں کہ ہم "ماڈرن اسلام" کو ختم کر دیں گے۔ بہت اچھا! لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ جس (ANCIENT ISLAM) کو وہ رائج کرنا چاہتے ہیں، اس میں قانون سازی کا معیار کیا ہوگا؟ چوہدری محمد علی صاحب اور مولانا مودودی صاحب ۱۹۵۶ء کے آئین کو دوبارہ زندہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ چوہدری صاحب نے نہ تو اپنے آئین میں اس امر کی تصریح کی تھی کہ "سنت" سے مفہوم کیا ہے اور اسے کیسے متعین کیا جائے گا ــــ یعنی یہ کس طرح طے کیا جائے گا کہ کوئی قانون سنت کے مطابق ہے یا نہیں ــــ نہ ہی انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے تو اتنا کہ "ہم ایک روحانی انقلاب لانا چاہتے ہیں"۔ باقی رہی جماعتِ اسلامی، سو ان کے متعلق ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جس چیز کو وہ "سنت" کہتے ہیں، جمعیت اہلِ حدیث اسے سنت کے خلاف ہوائی حملوں سے تعبیر کرتی ہے اور مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب (جو دیوبندی فرقہ سے متعلق ہیں) کا ارشاد ہے کہ مودودی صاحب سے کسی مفاہمت کا سوال اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب وہ پہلے اپنی تمام کتابوں کو جلا ڈالیں۔ حیرت ہے کہ قوم کے "لیڈروں" میں ایک بھی ایسا نہیں جو اس بنیادی سوال پر (کہ ملک میں قانون سازی کا معیار کیا ہوگا) ذرا بھی سنجیدگی سے سوچے۔ کس قدر الم انگیز اور اندوہناک ہوتی ہے قوم کی وہ حالت جس میں کسی قلبِ حساس کو چیخ کر کہنا پڑے کہ أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ۔ (۱۱/۷۸) کیا تم میں کوئی ایک بھی معقول آدمی نہیں! ــــ ملک کے "مسٹر طبقہ" نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ سوال مذہب سے متعلق ہے اس لئے ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں ــــ وہ یہ نہیں سوچتا کہ ملک میں جو قوانین بنیں گے وہ "مسٹروں" کے لئے الگ اور "مولویوں" کے لئے الگ نہیں ہوں گے۔ اس لئے اس مسئلہ کا تعلق "مسٹروں" سے بھی ویسا ہی ہے جیسا "مولویوں" سے۔ مولوی صاحبان نے اس سوال سے پیچھا چھڑانے کے لئے آسان راستہ یہ اختیار کر رکھا ہے کہ جو اس سوال کو اٹھائے، اسے گالیاں دی جائیں۔

منکرِ حدیث - منکرِ رسالت - کافر - مرتد ٹھہرا دیا جائے - حالانکہ بات واضح ہے کہ آپ ہزار گالیاں دیجئے اور لاکھ فتوے لگائیے - یہ سوال اپنی جگہ پر موجود رہے گا۔ اور ایک نہ ایک دن آپ کو اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ مناظرہ اور مباحثہ نہیں کہ آپ دن بھر فریق ثانی کو جھوٹا ثابت کرتے رہے اور فریق ثانی آپ کو گمراہ قرار دیتا رہا۔ اور شام کو دونوں اٹھ کر اپنے اپنے گھر کو چلے گئے - یہ تو ملک کے لئے قانون بنانے کا سوال ہے - اس کے متعلق تو ایک فیصلہ پر پہنچنا ہوگا کہ زیرِ نظر قانون، کتاب وسنت کے مطابق ہے یا نہیں ہم (مثلاً) یہ پوچھنا چاہتے ہیں۔ جمعیت اہلِ حدیث کے ذمہ دار حضرات سے کہ پارلیمان میں ایک مسودہ قانون پیش ہوتا ہے - جماعت اسلامی کے ارکان اسے مطابق سنت قرار دیتے ہیں کیا آپ اسے بہرحال مطابق سنت تسلیم کرلیں گے جب کہ آپ ان کی سنت کی تعبیر کو سنت صحیحہ کے خلاف ہوائی قلعے قرار دیتے ہیں اور اس کی مخالفت کو جہاد سمجھتے ہیں؟ کیا آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ اس وقت معاملہ کے تصفیہ کی صورت کیا ہوگی؟ یہ سوال صرف جمعیت اہل حدیث ہی سے نہیں۔ ہر مذہبی فرقہ سے ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں خواجہ ناظم الدین اور چوہدری محمد علی صاحب سے کہ کیا آپ نے اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت سمجھی ہے کہ جب اس نکتہ پر کہ پیش نظر مسودہ قانون مطابق سنت ہے یا نہیں سنی، شیعہ - اہل حدیث - اہل فقہ - دیوبندی، بریلوی ارکان پارلیمان میں جنگ و جدال ہو گی تو کس فیصلہ پر کس طرح پہنچا جائے گا؟ ہم بالخصوص چوہدری صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جس ۱۹۵۶ء کے آئین کو آپ دوبارہ نافذ کرنا چاہتے ہیں کیا اس میں اس تصفیہ کے لئے کوئی شکل بتائی گئی ہے اور اگر اس میں نہیں بتائی گئی تو کیا آپ کے ذہن میں کوئی شکل ہے؟ کیا آپ کتاب وسنت کے معیار پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا قانون ـــــ مثلاً یہ کہ بیوی کو طلاق کیسے دی جائے ـــ ایسا بنا سکتے ہیں جو (مثلاً) اہل حدیث اور حنفی حضرات دونوں کے لئے قابلِ قبول ہو؟ اگر آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے تو کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آپ اور آپ کے نظامِ اسلام کی پارٹی اسمبلی میں جاکر کریگی کیا؟ اور یہی سوال ہم ہر اس پارٹی سے کرنا چاہتے ہیں جس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ کریں گے۔ ہم ہر اس پاکستانی سے، جس کے دل میں اسلام کا پاس اور ملت کے مستقبل کا خیال ہے گزارش کریں گے کہ وہ مختلف پارٹیوں کے لیڈروں سے پوچھے کہ کیا انہوں نے پاکستان کے اس بنیادی مسئلہ پر غور کیا ہے اور اگر کیا ہے تو ان کے ذہن میں اس مشکل کا حل کیا ہے؟ ان سے پوچھئے کہ آپ اسمبلی میں جاکر، پاکستان کے لئے قوانین کس اصول اور معیار کے مطابق مرتب کریں گے۔ اس کے جواب میں انہیں مبہم اصطلاحات اور مقدس لفظوں میں نہ الجھنے دیجئے۔ ان سے کہئے کہ ہمیں ہماری زبان میں، واضح اور متعین طور پر بتایئے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کس طرح مرتب ہوں گے ـــ ایسے قوانین جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ ان سے کہئے کہ ہم الیکشن میں صرف اس پارٹی کا ساتھ دیں گے جو اس سوال کا اطمینان بخش جواب دے۔ ان سے تقاضا کیجئے کہ وہ اس سوال کے جواب کو اپنے انتخابی منشور میں درج کریں۔ یاد رکھئے! پاکستان کا مستقبل اس ایک سوال کے حل پر موقوف ہے۔ یہ لیڈر دس برس سے قوم کو اندھیرے

میں سکے چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کی خواہش یہ ہے کہ قوم اسی طرح اندھیرے میں رہے۔ آپ ان سے برملا کہہ دیجئے کہ اب ہم مزید اندھیرے میں نہیں رہنا چاہتے۔ ہماری موافقت اور مخالفت کا یہی معیار ہے۔ یہ ہمارے نزدیک قولِ فیصل ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہم یہ پرکھنا چاہتے ہیں کہ کون اس کا اہل ہے کہ وہ مجلس قانون ساز میں پہنچ کر اس بنیادی فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکے۔

یاد رکھئے! آپ کے اس سوال کا جواب ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہو گا لیکن یہ آپ کو چھلیے میں ٹالنے کی کوشش کریں گے۔ آپ ان کے فریب میں نہ آ جایئے۔ ممکن ہے مسٹروں کا طبقہ یہ کہے کہ یہی تو وہ دشواری ہے جس کے پیش نظر ہم یہ کہتے ہیں کہ مذہب کو امورِ مملکت سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ مذہب، انسان اور خدا کا پرائیوٹ معاملہ ہے۔ لے سیاست سے کیا سروکار؟ ان سے کہئے کہ یہ بات اس آئیڈیالوجی کے خلاف ہے جس کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے یہ کس طرح قابلِ قبول ہو سکتی ہے؟

مذہب پرست طبقہ کہے گا کہ اس کا فیصلہ بہت آسان ہے اور وہ یہ کہ ملک کا کوئی قانون "قرآن اور سنت" کے خلاف نہیں ہو گا۔ ان سے کہئے کہ قرآن کے متعلق تو ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک متعین کتاب ہے جسے ہر فرقہ کا مسلمان، خدا کی کتاب تسلیم کرتا ہے لیکن کیا کوئی ایسی کتاب بھی موجود ہے جس میں ایسی سنت رسول اللہ درج ہو جسے ہر فرقہ کا مسلمان سنتِ رسول اللہ تسلیم کرتا ہو؟ اس کے جواب میں یہ کہہ دیا جائے گا کہ اس کا فیصلہ علمائے کرام کریں گے کہ کون سا قانون "سنت" کے خلاف ہے۔ ان سے پوچھئے کہ کیا کسی ایک فرقے کے علماء اس کا فیصلہ کریں گے یا مختلف فرقوں کے علماء؟ اگر ایک فرقہ کے علماء فیصلہ کریں گے تو ان کا فیصلہ دوسرے فرقہ والوں کے لئے کس طرح قابلِ قبول ہو گا۔ اور اگر یہ کام مختلف فرقوں کے علماء کے سپرد کیا گیا تو جو علماء آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ نماز میں ہاتھ باندھنا مطابق سنت ہے یا ہاتھ چھوڑنا۔ اور اگر ہاتھ باندھنا مطابق سنت ہے تو سینے پر ہاتھ باندھنا یا ناف پر، تو وہ اس بات پر کیسے متفق ہو جائیں گے کہ فلاں قانون مطابق سنت ہے یا نہیں۔ آپ کے اس سوال پر انہیں غصہ آ جائے گا ۔۔۔ اس لئے کہ جس شخص کے پاس کسی بات کا جواب نہ ہو اسے غصہ آ جایا کرتا ہے ۔۔۔ لیکن آپ کو غصہ نہیں آنا چاہیئے۔ آپ تو ایک ایسے مسئلہ کا حل تلاش کر رہے ہیں جس پر پاکستان کے مستقبل کا دارومدار ہے اور مسائل کا حل غصے سے کبھی نہیں ملا کرتا۔ یہ تو ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد ملا کرتا ہے۔

ممکن ہے اس مقام پر آپ خود بھی مایوس ہو جائیں کہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس کا حل مل ہی نہیں سکتا۔ لیکن آپ کے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ خدا نبوت کے دروازے کو بند کر دے اور امت کو ایسی حالت میں چھوڑ دے کہ وہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہے لیکن اس کے لئے ایسا کرنا ناممکن ہو۔ یہ چیز خدائے تعالیٰ سے بہت بعید تھی۔ اس نے اس مشکل کے حل کے لئے اپنی کتاب کو محفوظ رکھنے کا ذمہ خود لیا تھا۔ اس کی کتاب محفوظ شکل میں

جائے۔ پاس موجود ہے اور ہر فرقہ کا مسلمان اسے متفقہ طور پر خدا کی کتاب اور دین کی سند مانتا ہے۔ اس نے اس کتاب میں واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا - لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ - (۶/۱۱۶)

تیرے رب کی بات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہوگئی ہے۔ اس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

اس سے دو باتیں صاف طور پر سامنے آجاتی ہیں۔ یعنی۔

(۱) دین غیر متبدل ہے۔ اور

(۲) جو کچھ غیر متبدل ہے وہ قرآن میں تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔

لہٰذا، جو کچھ قرآن سے باہر ہے وہ غیر متبدل دین نہیں، دین پر عمل کرنے کے طریقے ہیں۔ مثلاً قرآن کا یہ حکم کہ "عدل کرو" غیر متبدل دین ہے۔ کن حالات میں کس طرح عدل کرو۔ یہ دین پر عمل کرنے کا طریقہ ہوگا۔ قرآن کے غیر متبدل دین کو تمام فرقے تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اختلاف دین پر عمل کرنے کے طریقوں میں ہے۔ مشکل وہاں آپڑتی ہے جہاں ہم ان طریقوں کو بھی غیر متبدل دین سمجھ لیتے ہیں جو مختلف فرقوں کے ہاں رائج ہیں۔ اگر متبدل اور غیر متبدل کے اس فرق کو سمجھ لیا جائے تو قانون سازی کے سلسلے میں کوئی دقت ہی پیش نہیں آسکتی۔ یہی وہ بنیادی نکتہ تھا جسے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی فراست قرآنی نے خوب سمجھا تھا۔ جب انہوں نے فرمایا کہ اس مقصد کے لئے ضرورت ہے

ایک ایسے جرأت مند مرد مومن کی جو روح عمرؓ کو لے کر

اٹھے اور پورے حزم و یقین سے کہہ دے کہ ـــــــــ

حسبنا کتاب اللہ ۔ (خطبات اقبال)

اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمیں ان احادیث کو جن کا تعلق قانون سے ہے، ان احادیث سے الگ کر لینا چاہیئے جن کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ اس (ثانی الذکر) حصہ میں کسی کو اختلاف نہیں۔ ہر مسلمان اپنی سیرت و کردار کے لئے نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو بطور مشعل راہ اپنے سامنے رکھتا ہے۔ یہ اتباع سنت سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ باقی رہا قانون سازی کا معاملہ، سو اس کے لئے بنیادی معیار قرآن کریم کو رکھنا چاہیئے کیونکہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے چھٹے خطبہ میں اسے شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔

یہی وہ اصول ہے جس کے مطابق اسلامی مملکت کے لئے وہ قوانین بن سکتے ہیں جن کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اس سے امت میں پھر سے وحدت پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی سے ہم پھر ایک نقطہ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اگر علامہ اقبالؒ آج زندہ ہوتے تو وہ پاکستان کے لئے اسلامی قوانین اسی اصول کے مطابق مرتب کرتے۔ یہی وہ اصول ہے جسے طلوع اسلام ایک عرصے سے پیش کر رہا ہے۔

کیا اس اصول کو پیش کرنے والے علامہ اقبالؒ منکرِ سنت تھے؟

اگر وہ منکرِ سنت نہیں تھے تو طلوعِ اسلام کس طرح منکرِ سنت قرار پا سکتا ہے۔ یاد رکھئے! یہ سب ان لوگوں کا پروپیگنڈہ ہے جو چاہتے ہیں کہ امت میں وحدت پیدا نہ ہو۔ جن کا مفاد اس میں ہے کہ مسلمان فرقوں میں بٹے رہیں اور فرقے آپس میں لڑتے رہیں۔ جو پاکستان کو ایک کامیاب اسلامی مملکت دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ جو دنیا پر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام نے ایک تجربہ کیا تھا جو ناکام رہا۔ اب اس ناکام تجربے کو دہرانا حماقت ہے۔ مذہب کی بنیادوں پر مملکت بن ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس اصولِ قانون سازی کی مخالفت کرتے ہیں جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا اور جس کے سوا کوئی اور اصول ممکن العمل نہیں۔ اگر ملّتِ پاکستانیہ نے اس اصول کو اختیار کر لیا تو پاکستان میں اسلامی قوانین مرتب اور نافذ ہو سکیں گے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ اس مملکت میں اسلامی قوانین مرتب نہیں ہو سکیں گے، فرقوں کا باہمی اختلاف اور بڑھتا جائے گا۔ اور یہ سرزمین فساد انگیزیوں اور خوں ریزیوں کی آماجگاہ بن جائے گی۔ اس لئے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں اگر یہ صورت ہوئی کہ جس فرقہ کی اکثریت ہوئی اس نے اپنے قوانینِ شریعت کو دوسرے فرقوں سے جبراً منوانا چاہا تو اس سے مخالفت کی آگ بہت تیز ہو جائے گی۔ اگر اس خلفشار سے تنگ آ کر کسی پارٹی نے سیکولر انداز میں قانون سازی کا اصول اختیار کر لیا تو یہ صورتِ حالات پاکستان کی آئیڈیالوجی (دین) سے محبت رکھنے والوں کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ لہٰذا مملکت میں اختلاف و انتشار عام ہو جائے گا۔ (اللہ اس سرزمین کو ان مفسدات سے محفوظ رکھے)۔

ہم قوم کے سنجیدہ طبقہ سے ایک بار پھر اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس بنیادی مسئلہ کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے۔ اور ملک کو اس بھنور سے نکالنے کی کوشش کرے جس میں یہ گزشتہ سولہ برس سے بُری طرح مبتلا چلا آ رہا ہے اور اسے اس صحیح راستے پر ڈالنے کی فکر کرے جو اسے اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جائے —— اور ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس کے لئے سلجھے ہوئے دماغ اور جرأت مند قلب کی ضرورت ہے۔ دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر!

محترم عبدالرب صاحب

تجارت

تجارت یا خرید و فروخت کا کاروبار بہت بلند پیشہ ہے۔ ہمارے نبی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت فرمائی۔ خود اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں سے خرید و فروخت کا معاملہ کر رکھا ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹:۱۱۱) اللہ نے مومنوں سے جنت کے عوض ان کے جان اور مال خرید لئے ہیں۔ کہتے ہیں برکت کے "سو حصوں میں سے تجارت کو "نوّے" اور باقی سب پیشوں کو "دس" حصے ملے ہیں تجارت میں برکت خدمت سے ہے۔ مخلوق خدا کی خدمت انسانیت کا جوہر ہے ؎

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

تاجر ضرورت کی چیزیں یہاں وہاں دور دور سے مخلوقِ خدا کے لئے جمع کرتا ہے۔ تاجر نہ ہو تو چیزوں کا حاصل کرنا مشکل کیا ناممکن ہو جائے۔ اناج۔ ترکاریاں۔ چارہ دور دراز دیہاتوں میں بسنے والے کسان اگاتے ہیں۔ پھل پھلاری باغبان بہم پہنچاتے ہیں۔ چارہ کی بدولت دودھ۔ مکھن۔ گوشت مویشیوں سے ملتا ہے۔ خدا جانے یہ دنیا کب سے آباد ہے۔ زمین ہے کہ ساری آبادی کا پیٹ بھرنے کے لئے خوراک ہمیشہ سے برابر اگل رہی ہے۔ خوراک کے ختم نہ ہونے والے خزانے اللہ تعالیٰ نے زمین میں بھر دئے ہیں۔ یہی خزانے ہیں جن سے جانداروں کے رزق کا ذمہ جو اللہ نے لیا ہے پورا ہوتا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱:۶) زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہو۔ کھانے پینے کے علاوہ استعمال کی چیزیں بھی اسی زمین کی بدولت میسر ہیں۔ روئی۔ پٹ سن۔ گنا۔ لوہا۔ تانبا۔ گیس کی چیزیں کو لوگوں تک پہنچانا دشوار کام ہے۔ تاجر یہ دشوار کام انجام دیتا ہے۔ اسی سے تجارت میں بلندی، اہمیت اور برکت ہے۔

خدمت، تجارت کی جان اور منافع اس کا جسم ہے جسم اور جان (یعنی منافع کی خواہش اور جذبۂ خدمت) میں موافقت ہے تاجر کی شان ہے اور منافع کی بیجا ہوس سے بچنا تاجر کے لئے جان جوکھوں کا کام ہے۔

خصوصاً اس وجہ سے کہ منافع خوری کے مواقع تاجر کے سامنے خود بخود آتے رہتے ہیں۔ خریدار ضرورت سے مجبور ہوتا ہے۔ اس کی مجبوری کا احساس تاجر کو زیادہ قیمت مانگنے پر اکساتا ہے۔ وہ بڑھ چڑھ کر قیمت طلب کرتا ہے۔ خریدار منہ مانگی قیمت ادا کرتا ہے مگر اس سودے میں تجارت کا بنیادی مقصد (یعنی خدمت خلق) فوت ہو جاتا ہے۔ منافع کی ہوس پر قابو پانا تاجر کے لئے کٹھن منزل ہے مگر ہمت والے ہر کٹھن منزل کو سر کر لیتے ہیں۔ اس منزل کو سر کرنے کے لئے قرآن مجید نے مؤثر ہدایات دی ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے "وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ" (۴/۲۹) (ایک دوسرے کا مال دھوکہ اور فریب سے مت کھاؤ بلکہ ایسی تجارت سے حاصل کرو جس میں خریدار اور تاجر دونوں مطمئن ہوں۔ ناحق مال کھا کر لوگوں کو قتل یعنی تباہ و برباد نہ کرو)۔ تجارتی حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ گاہک سے اور خدا سے مانگنے میں کمی ہرگز مت کرو۔ چیز کی قیمت خریدنے گاہک بالعموم ناواقف ہوتا ہے ہوشیار دکاندار گاہک کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی قیمت مانگتا ہے جسے گاہک کی جیب برداشت کر سکے۔ چار پیسے کی چیز کے وہ بلا تکلف چار آنے مانگ لے گا۔ گاہک نے بہت ہمت کی تو دو آنے لگا کر چیز خرید لے گا۔ اور دکاندار کو دگنے دام وصول ہو جائیں گے۔ یہ ہے دوسرے کا مال "بالباطل" کھانے کی مثال۔ اس مثال میں سودا بظاہر گاہک اور دکاندار کی رضامندی یعنی "عن تراض منکم" سے ہوا۔ لیکن یہ رضامندی ناواقفیت اور مجبوری کی رضامندی ہے۔ دل کی رضامندی نہیں ہے۔ کسی کا عزیز تکلیف میں تڑپ رہا ہے۔ دوا صرف چور بازار میں دس گنی قیمت پر مل سکتی ہے۔ دس گنی قیمت دینے پر خریدار مجبور ہے۔ وہ اس امر پر رضامند ہرگز نہیں ہے۔ گاہک کی ناواقفیت یا مجبوری پر مبنی سودوں کی کثرت ہو جائے تو دیکھنے والی آنکھ کو ہر طرف اقتصادی تباہی اور بربادی نظر آئے گی۔ اس ہولناک منظر کو قرآن مجید نے لوگوں کے قتل سے تعبیر کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سودے بازی میں تاجر کا ہاتھ عموماً اونچا ہوتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ایسے گاہک ناپید ہیں جو تاجر کو جل دینے کی کوشش کرتے ہیں اور بسا اوقات کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ایسے دھوکہ باز گاہک "لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل" کے حکم میں اسی طرح آتے ہیں جس طرح بھولے بھالے گاہک کو ہاں کہنے پر مجبور کرنے والا تاجر۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے "واوفوا الکیل والمیزان بالقسط" (۶/۱۵۲) ناپ تول پوری کرو۔ اس طرح کہ گاہک اور دکاندار دونوں کے مفاد سلامت رہیں۔ مزید زور کے لئے فرمایا "ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوہم او وزنوہم یخسرون" (۸۳/۱-۳) تباہی بربادی اور ہلاکت ہے کمی کرنے والوں کے لئے۔ جو لیتے وقت پوری ماپ لیتے ہیں اور دیتے وقت ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ تجارت کا کاروبار ناپ تول کا کاروبار ہے۔ اس میں ذرا سا فرق بھی تاجر کی ایمانداری اور بے ایمانی کا پول کھول دیتا ہے۔ ناپ تول میں کمی آسانی سے پکڑی جاتی ہے۔ قرآنی آیات کا منشا یہ ہے کہ تاجر دیانتداری کو ہرگز نہ چھوڑے نہ گاہک کے حق میں کمی کرے نہ اپنے حق میں۔ "بالباطل" اور

ذیل میں تجارت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب بعض سے اقوال ہیں۔

—— تمام کمائیوں میں پاک کمائی ان تاجروں کی ہے جو معاملات میں جھوٹ نہ بولیں۔ لین دین میں خیانت نہ کریں وعدہ کریں تو اسے پورا کریں۔ جب کوئی چیز خریدنا چاہیں تو قیمت گرانے کے لئے اس کی برائی نہ کریں۔ اور جب کچھ بیچنا چاہیں تو قیمت بڑھانے یا خریدار کو رغبت دلانے کے لئے اس چیز کی تعریف میں مبالغہ نہ کریں۔ ان پر کسی کا قرض ہو تو ادا کرنے میں سستی اور ٹال مٹول سے کام نہ لیں اور اگر کسی پر ان کا قرض ہو تو تقاضہ میں سخت کلامی اور بے مروتی سے پیش نہ آئیں۔

—— جھوٹ بول کر مال بیچنے والا تاجر اور تجارت میں بے ایمانی کرنے والے دکاندار قیامت کے دن بدترین گنہگاروں کی صف میں ہوں گے۔

—— تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ نہ کلام کرے گا نہ انہیں رحمت کی نظر سے دیکھے گا۔ نہ انہیں گناہوں سے پاک کرے گا بلکہ ان پر عذاب ہوگا۔ ایک تکبر کرنے والا۔ دوسرا کسی پر احسان کر کے جتانے والا اور تیسرا جھوٹی قسم کھا کر اپنا مال بیچنے والا۔

—— جو مال اپنی ملکیت یا قبضہ میں نہ ہو وہ مت بیچو۔

—— تجارت کے نفع میں سے کچھ خیرات کر دیا کرو تاکہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور نادانستہ خطاؤں کی تلافی ہو جایا کرے۔

—— قسم سے مال کی نکاسی تو ہوتی ہے لیکن مال کی برکت جاتی رہتی ہے۔

—— کھیتی کا غلہ یا باغ کی بہار اس وقت تک مت بیچو جب تک وہ پختگی کو نہ پہنچ جائے۔

—— جو زمین تم خود کاشت نہ کرو اسے مسلمان بھائی کو کاشت کے لئے دے دو۔ اس سے کرایہ لو نہ بٹائی کا معاملہ کرو۔

تجارت میں جتنی بدعنوانیاں ہو سکتی ہیں آج کل وہ سب بکثرت پائی جاتی ہیں ہر شے میں ملاوٹ اور چور بازاری ہے قیمتیں آسمان کو جا رہی ہیں۔ ناپ تول میں احتیاط مفقود ہے۔ درآمد و برآمد میں بے ایمانی کی شکایت عام ہے۔ نہ ملکی بدنامی کا خیال ہے نہ قومی ذلت کا احساس۔

تجارت میں بدعنوانیوں کی بنیاد تاجر کی بڑھی ہوئی ہوسِ منافع خوری ہے۔ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے وہ ہر حربہ کا استعمال صحیح سمجھتا ہے۔ دولت جمع کرنے کا سودا ساری عمر سر میں سمایا رہتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲) دولت سمیٹنے کا جنون قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔

منافع خوری کی ہوس پر قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ تاجر کے جائز منافع کا تعین ہو۔ یہ کام آسان نہیں۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے قرآن مجید نے دو اصول بتائے ہیں۔ ایک اصول یہ ہے کہ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی اور تم پر ظلم کرے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹) یعنی نہ تم کسی کے حق میں کمی کرو اور نہ کسی کو اپنے حق میں کمی کرنے دو۔ اور دوسرا اصول یہ ہے کہ انسان کا حق اتنا ہی ہے جتنا اس نے محنت کر کے حاصل کیا ہو لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)

تاجر اپنی محنت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ دکان کا حصول۔ چیزوں کی فراہمی۔ فراہم شدہ چیزوں کی حفاظت اور آخر کار ان کی فروخت ایسے امور ہیں جو محنت اور کاوش چاہتے ہیں اور تاجران سب سے عہدہ برآ ہوتا ہے وہ جسمانی محنت بھی کرتا ہے اور دماغی کاوش بھی۔ یہ دماغی قابلیت ہی ہے جس کی بدولت تاجر کو لبا اوقات بہت سا منافع مل جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سارے منافع کا وہ بلا شرکت غیرے حق دار ہے یا نہیں۔ جہاں تک دماغی قابلیت کا تعلق ہے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ تاجر کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہے۔ وہ پیدائشی ہے اور قدرت کا انعام۔ اس لئے دماغی قابلیت کے ذریعہ جو معاوضہ حاصل ہوتا ہے تاجر اس کا بلا شرکت غیرے حقدار نہیں ہو سکتا۔ اس معاوضہ کو اسے دماغی قابلیت دینے والے کی طرف لوٹانا ہوگا۔ انسانی محنت میں قدرتی اسباب کی اعانت کو جو اہمیت ہے اسے قرآن مجید نے سورۃ واقعہ کی آیات ۶۳ تا ۷۲ میں کھیتی۔ بارش وغیرہ کی مثالوں سے بڑے لطیف انداز سے سمجھایا ہے۔ زمین تیار کر کے تم بیج بوتے ہو۔ پانی دیتے ہو اور فصل کی رکھوالی کرتے ہو لیکن فصل کی تیاری میں تمہاری کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک آسمان سے پانی نہ برسے اور سورج سے حرارت اور روشنی۔ اور زمین اور ہوا سے پودوں کو خوراک نہ ملے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ لے لو باقی اسے دو جس نے پانی۔ حرارت۔ ہوا اور روشنی مہیا کی ہیں۔

تاجر چاہے تو قرآن مجید کے ان اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنا منافع ایسا مقرر کر سکتا ہے جس میں نہ گاہک پر ظلم ہو اور نہ تاجر پر۔ اس کا یہ اقدام پاکستان کی آئیڈیالوجی کے عین مطابق ہوگا۔

خدا کرے کہ ہمارے تاجر قرآنی اصولوں پر کاربند ہو جائیں اور اپنے کاروبار میں وہ طرز عمل اختیار کریں جو اللہ اور اس کے رسول نے بتایا ہے يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا (۴۸/۲۹) اللہ کا فضل اور منافع چاہیں تو اس کی رضی کے مطابق یہ اصول اور یہ طرز عمل کی وہ بنیاد ہے جس پر قائم ہو کر تجارت کا پیشہ خریدار دکاندار قوم۔ ملک۔ اور ساری انسانیت کیلئے باعث رحمت اللہ بن سکتا ہے۔

خریداروں کی توجہ کے لئے

چندہ ختم ہونے کی اطلاع کے طور پر، متعلقہ خریداروں کے پرچے میں (پہلا ورق اُلٹنے ہی) ایک مطبوعہ کارڈ منسلک ہوتا ہے جسے حسب منشا اندراج کے ساتھ ادارہ کو (بلا ٹکٹ) واپس ارسال کرنا ہوتا ہے۔ لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بیشتر خریدار ان کارڈوں کو واپس بھیجنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اسے پیش نظر رکھیئے کہ یہ بے نیازی ادارہ کے لئے شدید پریشانی کا موجب بنتی ہے ——— ادارہ

نئی نسل کی قلب و نگاہ کے لئے

دینِ خداوندی کی دعوتِ انقلاب

سلیم کے نام خطوط

(تین جلدوں میں)

(از پرویز)

• خالص قرآنی فکر کی روشنی میں عصرِ حاضر کے اہم ترین مسائل حیات کا حل

• مفکرِ قرآن کا مخصوص دل نشین اور حقیقت آفریں اندازِ نگارش

اہم عنوانات

ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟ ذات پات کی تمیز۔ طلاق کا قرآنی مفہوم۔ اسلامی نظام کے بنیادی اصول۔ مغربی اور قرآنی تہذیب کے بنیادی اصول۔ کمیونزم اور اسلام۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم۔ خدا کا تصور۔ مقامِ محمدیؐ۔ کائنات کے عظیم انقلاب۔ رحمۃ للعالمین۔ درود کا مفہوم۔ اطاعتِ رسولؐ۔ اسلامی قوانینِ شریعت کے ماخذ۔ جشنِ نزولِ قرآن۔ اندھے کی لکڑی۔ تصوف قرآن کریم کی روشنی میں، ہماری تاریخ۔ اسلامی آئیڈیالوجی۔ اسلام آگے کیوں نہ چلا؟ تینوں جلدیں ۴۴ اہم خطوط پر مشتمل ہیں۔ عمدہ سفید کاغذ، ٹائپ کی بہترین و دیدہ زیب طباعت۔ جلد اول ۵ روپے۔ جلد دوم — ۶ روپے — جلد سوم ۶ روپے۔

طاہرہ کے نام خطوط

ماؤں کی آغوشِ تربیت ہر قوم کی داستانِ عروج و زوال کا حرفِ آغاز بنتی ہے۔ خدا کا دین ملت کی ہر بہو بیٹی اور ماں کو کس بلند مقام پر فائز کرتا ہے۔ ان کے قلب و نگاہ میں کس قسم کا انقلاب لانا چاہتا ہے؟ اس انقلاب کی بدولت ہماری عائلی زندگی کے "تلخابے کیونکر جامِ شیریں کی گردش میں بدل سکتے ہیں۔ نئی نسل کی تربیت کس حسنِ انداز سے ہو گی۔

ان اہم سوالات کا جواب، قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں، اس کتاب میں دیکھئے! ان خطوط کے ذریعے پرویز صاحب نے اپنی ملت کی ہر طاہرہ بیٹی کو قرآن کا زندگی بخش پیغام دیا ہے۔ جلد اول —— دو روپے جلد دوم —— ڈھائی روپے۔

میزان پبلیکیشنز (۲۷ بی) شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

باسمہ تعالیٰ

جنگ

اور

انسان

محترم پرویز صاحب کی

طلوعِ اسلام کنونشن

۱۹۶۳ء

میں تقریر

شائع کردہ
ادارۂ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ
لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنگ اور انسان

جیسا کہ میں نے ایک دفعہ اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

انسان بھی ایک طرفہ تماشا ہے

اسے عبادت گاہوں میں محوِ نیاز دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کے ذوقِ عبودیت پہ نثار اور جنت کی حوریں اس کی جھکی ہوئی پیشانی پر تصدق ہوتی ہیں۔ اس کا ایک ایک سجدہ، زمین اور آسمان کو وجد میں لاتا، اور فضائے کائنات میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔

اور اگر اسے محبت کے حریمِ ناز میں سر بزانو دیکھو تو کسی کی یاد میں اس کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ شب کی تاریکیوں میں شمع کافوری کا کام دیں۔ آفتاب، اس کے دل کی تپش و خلش سے حرارت مستعار لیتا ہے کہ وہ اس سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کر دے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے سوز و گداز سے، اپنے اندر نئی زندگی محسوس کرتا ہے۔

اور اگر اسے حیرت خانۂ علوم و فنون میں سرگرمِ تحقیق دیکھو تو اس کا فکرِ فلک پیما، زمین کی پستیوں سے آسمان کے راز فاش کرتا اور زہرہ و مہ و ستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے۔ وہ زہر سے تریاق بناتا اور پتھر کو آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی اختراعاتِ جمیلہ، تہذیب و تمدن کے قصرِ رنگیں میں، نور و نکہت کی ندیاں رواں کر دیتی ہیں۔

لیکن —— یہی انسان جب نشۂ قوت سے بدمست، اور ہوسِ خون آشامی سے مدہوش ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح امنڈتا ہے تو عبودیت کا عجز و نیاز، محبت کا سوز و گداز، اور علم و حکمت کا ساز و براق، سب اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جاتے

ہیں۔ یہ خود اپنے ہاتھوں کے تعمیر کردہ قصرِ تہذیب و تمدن کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں' اور انسان کا خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو جاتا ہے۔

اس کی ساری تاریخ' اسی خوں ریزی اور آتش باری کی ہولناک داستان ہے۔ یہ جوں جوں علم و عقل میں آگے بڑھتا جاتا ہے' اس کی تباہ کاریوں کی وسعت حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ

خوں ریزی کی وسعتیں

جب دارا نے یونان کی طرف لشکر کشائی کی تو اس کے ساتھ صرف دس ہزار فوج تھی۔ جب اسکندر نے ایشیا کی طرف رُخ کیا تو اس کے جلو میں تیس ہزار کا لشکر تھا۔ جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تو پانچ لاکھ فوج اس کے زیرِ کمان تھی۔ گذشتہ جنگ عظیم میں صرف مقتولین اور زخمیوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد تھی۔ اور کہا جا رہا ہے کہ اگر اب کے جنگ چھڑی تو ایک بم' پورے کے پورے کرۂ ارض کو بھک سے اڑا دے گا۔ وَ يَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَ الْإِكْرَامِ (۵۵/۲۷)۔ صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔

یہ تو انسان کی سیاسی دنیا کی داستانِ خوں ریز تھی۔ اس کی فکری دُنیا کی طرف آئیے تو وہاں بھی یہ عجیب مجموعۂ تضاد دکھائی دے گا۔ اگر ایک طرف اس نے یہ فلسفہ وضع کیا کہ ایک جیونٹی کا مارنا بھی مہاپاپ (گناہِ عظیم) ہے' اور انسان کو منہ پر کپڑا باندھے رکھنا چاہیئے تاکہ جراثیم' سانس کے ذریعے اندر جا کر ہلاک نہ ہو جائیں اور اس طرح انسان' جیوہتیا کے جرم کا مرتکب نہ ہو جائے' تو دوسری طرف ہم نیٹشے کے الفاظ میں یہ سنتے ہیں کہ

> Men should be educated for war and women for the recreation of the warriors. Everything else is folly.

مردوں کو سپاہ گری کی تعلیم دینی چاہیئے اور عورتوں کا مقصدِ زندگی' ان سپاہیوں کی تفریح کا سامان بننا۔ اس کے سوا جو کچھ ہے سب بکواس ہے۔ مسولینی کا قول تھا کہ جنگ بالکل اخلاقی چیز ہے۔ ہٹلر کہا کرتا تھا کہ اب ایک نئی دنیا وجود میں آ چکی ہے جس میں جنگ ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنگ ہر شے کے ماپنے کا ذریعہ ہے اور قانون وہی ہے جسے ایک سپاہی وضع کرے۔ فرد اور معاشرے کے صرف وہی کام قابلِ ستائش قرار پا سکتے ہیں جو جنگ کی تیاری میں مدد دیں۔

(HEINRICH HAUSER) کا قول ہے کہ

ہمیں چاہیئے کہ ان تمام اداروں کو توڑ ڈالیں جو انسان کو امن اور

حفاظت کی ضمانت دیتے ہیں۔ زندگی صرف اسی وقت محکم اور سادہ ہو سکیگی جسے بربریت کا عہد کہا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس افراط و تفریط میں، قرآن، اس سلسلہ میں، کیا فلسفہ اور مسلک پیش کرتا ہے؟

امن وسلامتی کا دین

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بالعموم ہر شخص امن اور سلامتی چاہتا ہے۔ جو لوگ اس سلسلہ میں کوئی نمایاں کام کرتے ہیں، دنیا کی ہر قوم انہیں واجب العزت سمجھتی اور ان کے پیچھے کثرت سے کرتی ہے۔ ہر سال کسی نہ کسی کو امن (PEACE) کا نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے خدا کی ایک صفت اَلسَّلَامُ اور دوسری اَلْمُؤْمِنُ بتائی ہے۔ اَلسَّلَامُ کے معنی ہیں وہ ذات جس سے ہر شے سلامتی حاصل کرے۔ اور مُؤْمِنُ کے معنی ہیں، امن کی ضمانت دینے والا۔ جس پر بھروسہ کر کے امن اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ خود اُس نظام زندگی کا نام جسے قرآن پیش کرتا ہے، اسلام ہے۔ اور جن لوگوں کے ہاتھوں سلامتی کا یہ نظام متشکل ہوتا ہے، انہیں مُؤْمِن کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اُس ضابطہ حیات (قرآن) کے متعلق، جو اس نظام کا آئین و دستور ہے کہتا ہے کہ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ (۵/۱۶) اس کے ذریعے خدا سلامتی کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ وہ اس کی دعوت کے متعلق کہتا ہے کہ وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ (۱۰/۲۵) خدا سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ مومنین کے مآل زندگی کے متعلق کہتا ہے کہ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ (۶/۱۲۸)۔ ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے۔ وہ جس معاشرہ میں رہتے ہیں، وہ معاشرہ امن اور سلامتی کا گہوارہ ہے۔ اور اس دنیا سے جانے کے بعد، فرشتے ان کا یہ کہہ کر استقبال کرتے ہیں کہ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (۱۳/۲۴)۔ تم نے دنیا میں، امن وسلامتی قائم رکھنے کے لئے جس استقامت کا ثبوت دیا تھا، اس کے بدلے میں یہاں تمہارے لئے امن وسلامتی کے تحائف ہیں۔ یہی امن وسلامتی کی حسین آرزو ہے جو صبح سے شام تک، ہر مسلمان کے ورد زبان رہتی ہے جب وہ آنے والے کا استقبال "السلام علیکم" کی صدائے نشاط افزا سے کرتا، اور اس کے جواب میں، وعلیکم السلام، کی نشید جاں فزا سنتا ہے۔

جب معاشرہ کے امن اور سلامتی کی فضا میں بگاڑ پیدا ہو جائے، تو اسے "فساد" کہا جاتا ہے جو

فساد ناپسندیدہ ہے

خدا کو بے حد ناپسند ہے۔ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲/۲۰۵)۔ وہ انسانوں کو تاکیداً حکم دیتا ہے کہ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ (۲/۱۱)۔ زمین

میں فساد مت برپا کرو۔ وہ مؤمنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا (۲۸/۸۳)۔ ان کا مسلک، دنیا میں سرکشی اور فساد برپا کرنا نہیں ہوتا۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام، امن و سلامتی کا پیامبر ہے، اور وہ دنیا میں فساد اور خلفشار کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس کا منتہائے نگاہ، دنیا سے فساد ختم کر کے، عالمگیر امن اور سلامتی کی فضا پیدا کرنا ہے۔

یہاں تک تو بات صاف ہے کہ ہر شخص امن اور سلامتی میں رہنا چاہتا ہے، اور اسلام امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں کو امن کے ساتھ نہ رہنے دے اور معاشرہ کی سلامتی کو بگاڑنے کی کوشش کرے، تو اس وقت کیا کیا جائے؟ اس کا جواب، ہمارا ہر روز کا تجربہ اور طرزِ عمل دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی حرکات پر اتر آتا ہے تو سب سے پہلے اسے

لیکن سرکشی کا کیا علاج؟

سمجھایا بجھایا جاتا ہے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہیں آتا تو اسے حوالۂ پولیس کر دیا جاتا ہے، اور جب عدالت اُسے مجرم پاتی ہے تو اُسے قید کر دیا جاتا ہے تاکہ امن پسند لوگ، اس کی شرانگیزی سے محفوظ رہیں۔

یہ تو ہوا کسی کا انفرادی فعل۔ لیکن اگر کوئی قوم اس قسم کی حرکات کرنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج؟

عیسائیت کی مروجہ تعلیم یہ کہتی ہے کہ ایسی صورت میں چاہیئے کہ اس قوم کی زیادتی کو برداشت کیا جائے۔ اس کے سامنے ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس طرح وہ خود ہی نادم اور پشیمان ہو کر اپنی زیادتی سے باز آجائے گی ـــــ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینا۔ جو شخص تمہارا کوٹ اتارے، اُسے واسکٹ خود اتار کر دیدینا ـــــ اس طرزِ عمل کو ظالم کی دراز دستیوں کا علاج بتایا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ کی نہیں ہو سکتی۔ یہ تجربہ پر صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ اور خود عیسائیت

عیسائیت کی تعلیم

کی تاریخ اس کی عملاً تردید کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈین انگے (DEAN INGE) جو دنیائے عیسائیت کا ایک نامور ترجمان ہے۔ اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں لکھتا ہے۔

> عدمِ مدافعت کا اصول، ایک چھوٹے سے گلے کے لئے 'ناموافق حالات میں زندگی بسر کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ لیکن ایک منظم سوسائٹی تشدد کے استعمال سے کبھی مجتنب نہیں رہ سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک عیسائی حکومت کو اپنے حدودِ مملکت میں

کسی جرائم پیشہ گروہ کو مغلوب نہیں کرنا چاہیئے۔ اور جب اسے تسلیم کرلیا جائے کہ ایسا کرنا ضروری ہے تو پھر اس حکومت کو دشمن کے حملہ کی مدافعت کرنی بھی ضروری ہوگی۔ فتنہ وفساد کی مدافعت نہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں جو کسی آئین و قانون کی پیروی نہیں کرتے۔ آگسٹائن کا بھی خیال تھا کہ ایسے حالات میں جنگ حق بجانب ہوتی ہے ...... عدل کے بغیر سلطنت کیا ہے؟ ایک بڑے پیمانے پر قزاقی (صفحہ ۱۷۵)۔

موجودہ اناجیل میں بھی بعض شہادات ایسی ملتی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیم ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کردینے کی نہیں تھی۔ مثلاً انجیل متی کے دسویں باب میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔

یہ نہ سمجھ کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے۔ اور بیٹی کو اس کی ماں سے۔ اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کردوں۔

مہاتما گاندھی کا اہنسا

خود ہمارے زمانے میں، ہندوستان میں، مہاتما گاندھی نے اہنسا (عدم تشدد) کا پرچار بڑے شد ومد سے کیا۔ اور اسے ایک خدائی فلسفۂ حیات کے طور پر پیش کیا۔ لیکن جب ملک میں عام بدامنی پھیلی، اور عورتوں تک کی عزت خطرہ میں نظر آئی تو انہیں بمجبوری یہ کہنا پڑا کہ

بجائے اس کے کہ ہندوستان کی عورتیں محسوس کریں کہ وہ بے بس ہیں، اس سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جائے اور عورتوں میں خنجر اور ریوالور رکھنے کا رواج ترقی پذیر ہو۔ (ہری جن۔ بابت ۱/۳/۱۹۴۷ء)

یعنی اہنسا کے پجاری کو یہاں تک کہنا پڑا کہ مرد تو ایک طرف، عورتوں کو بھی تشدد کا استعمال کرنا چاہیئے۔

یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے، اسی زمانے میں کہا تھا کہ

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اور اسی رشی کے چیلے، آجکل بھارت میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اس کے پیش کردہ فلسفے کے بطلان کی زندہ شہادت ہے۔

قرآن سطحی جذبات کو اپیل کرکے دوسروں کو وقتی طور پر خوش اور مطمئن نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے

حقائق کا سامنا کرتا، اور ان کا عملی حل پیش کرتا ہے۔

برائی کی روک تھام بھلائی سے

اس نے، سب سے پہلے تلقین کی کہ جہاں تک ہو سکے، برائی کو بھلائی سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ (۴۱/۳۴)

برائی کی مدافعت نہایت حسن کارانہ انداز سے کرو۔ اس سے یہ ممکن ہے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہے، وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے۔

دوسرے مقام پر اس نے مومنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ (۱۳/۲۲)۔ وہ برائی کو بھلائی سے روکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ برتاؤ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے نادانستہ برائی سرزد ہو جائے اور شریفانہ طرزِ عمل ان پر عمدہ اثر کرے۔

جرم کی سزا

لیکن اگر اس سے کام نہ چلے، اور جس سے شرافت کا سلوک کیا جاتا ہے، وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے، تو قرآن اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس کی زیادتی کی روک تھام قوت سے کی جائے، لیکن اس کا خیال رکھا جائے کہ سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے۔ اس کا ارشاد ہے وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا۔ جرم کی سزا، جرم کے مطابق ہونی چاہیئے۔ لیکن یہاں بھی قرآن ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس موقعہ پر بھی دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور اگر اسے معاف کر دیا جائے تو اس کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو ایسا کرنا بہتر ہے فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (۴۲/۴۰)۔ غور کیجئے! قرآن اس شخص کو بھی ظالم قرار دیتا ہے جو ایسے مجرم کو معاف نہ کرے جو اپنے کئے پر نادم ہو اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہو۔ اس سے اگلی آیت میں، اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے جہاں فرمایا کہ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْھِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝۔ جو شخص اس ظلم کا بدلہ لیتا ہے جو اس پر کیا گیا ہو، اس پر کوئی الزام نہیں۔ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زیادتی

کرتے ہیں۔ یہ لوگ الم انگیز سزا کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد ہے وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۴۲/۴۳) لیکن جو شخص دیکھے کہ عفو اور درگزر کر دینے سے مجرم کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو وہ اگر ہمت سے کام لے، اور مجرم کو سزا سے بچا لے تو یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

قرآنی اقدامات

آپ نے غور فرمایا کہ معاشرہ میں امن قائم رکھنے کے لئے قرآن، کیا کیا اقدامات تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

(i) دوسروں کے امن میں خلل ڈالنے والوں کو، سب سے پہلے، حسن سلوک سے رام کرنے کی کوشش کرو۔ ان میں اگر شرافت کا مادہ ہے تو یہ حسن سلوک ان کی اصلاح کر دے گا۔

(ii) اگر یہ تدبیر موثر ثابت نہ ہو، تو انہیں ان کے جرم کی سزا دی جائے۔ لیکن سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے۔

(iii) اگر دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے، اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح کا امکان ہے تو اسے معاف کر دیا جائے۔

(iv) لیکن جو لوگ ناحق ظلم اور زیادتی کریں، اور معاشرہ کے امن کو بگاڑیں۔ اور ان میں اصلاح کے امکانات بھی نہ ہوں، تو انہیں سزا دی جائے۔ یعنی ان کی زیادتی کی روک تھام کے لئے قوت کا استعمال کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں، السلام، اور المؤمن، خدا کی صفات بتائی ہیں، ان کے ساتھ المھیمن العزیز الجبار المتکبر (۵۹/۲۳)۔ کا بھی اضافہ کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ قیام امن و سلامتی کے لئے بعض اوقات قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

قانون کے ساتھ شمشیر کا نزول

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تنہا قانون، امن قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے ساتھ قوت کی بھی ضرورت ہے۔ سورۂ حدید میں ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ۔ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ۔ اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی نازل کیا اور میزانِ عدل بھی لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ؎ تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵)۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فولاد بھی پیدا کیا جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور یہ لوگوں کے لئے بڑی منفعت بخش چیز ہے کیونکہ اس کی

سختی سے دنیا کا امن قائم رہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے — کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعۂ اول ہے کہ جس میں — پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

جس قانون کی پشت پناہ قوت نہیں، وہ قانون وعظ و نصیحت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ قانون مؤثر ہی اسی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ قوت نافذہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام، جو ایک نظامِ زندگی کا نام ہے، عملی شکل اختیار کرنے کے لئے، ایک آزاد مملکت کا وجود ضروری سمجھتا ہے۔ اگر اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو وہ "مذہب" بن کر رہ جاتا ہے۔ دین کی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔ اور اس مملکت کی حفاظت، وہ اپنا اولین فریضہ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے جماعت مومنین سے تاکیداً کہا ہے کہ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ...... (۸/۶۰)۔ جہاں تک بھی تمہارے بس میں ہو، قوت پیدا کرکے اور گھوڑوں کے رسالے تیار رکھ کر، دشمنوں کے مقابلے کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو اور اپنی سرحدوں کی پوری پوری حفاظت کرو، تاکہ، اس طرح مستعد رہ کر، تم اپنے اور نظامِ خداوندی کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو، اور وہ تمہاری طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہ کرسکیں۔

لیکن یہ قوت، اس مملکت کی حفاظت کے لئے ہوگی جس میں نظامِ خداوندی نے ایک عملی شکل اختیار کرکے "امنِ عالم" کو قائم رکھنا ہے۔ اسے کمزور قوموں کو لوٹنے اور کچلنے کے لئے صرف نہیں کیا جائیگا۔ اس حقیقت پر قرآن کا وہ مقام شاہد ہے جہاں سب سے پہلے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ آئیے غور سے سنئے۔

جنگ کی پہلی اجازت

نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین نے تیرہ برس مکہ میں گزارے، اور مخالفین کے جور و ستم کو کامل صبر و سکون سے برداشت کیا۔ ان کی طرف سے ہر برائی کی مدافعت بھلائی سے کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ان کی طرف سے شدائد اور مصائب کا سلسلہ دن بدن زیادہ ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ، حق پرستوں کی اس مختصر سی جماعت نے اپنا گھر بار چھوڑ کر دُور، مدینہ میں جاکر پناہ لی۔ لیکن ان مخالفین نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا، اور تہیہ کرلیا کہ یا تو انہیں مجبور کردیا جائے کہ وہ اپنی دعوت کو چھوڑ دیں اور یا ان کا خاتمہ کردیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر ان کے خلاف چڑھ دوڑے۔ اب اس جماعت کے سامنے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یہ تھا وہ مقام جب انہیں پہلی مرتبہ میدانِ جنگ میں آنے کی اجازت دی گئی۔ سورۂ حج میں ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ

ظُلِمُوْا ؕ یہ لوگ جن پر اس قدر مظالم کئے گئے ہیں، اب، بالآخر انہیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ گھبرائیں نہیں وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ۔ خدا ان کی مدد کرنے پر یقیناً قادر ہے۔ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ۔ ان پر مظالم اس انتہا تک پہنچ چکے تھے کہ ان بیچاروں کو ان کے گھر بار سے بھی نکال باہر کیا گیا۔ اور ناحق ایسا کیا گیا۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں ان کے وطن تک سے نکال دیا گیا، اور اب جبکہ یہ دیارِ غیر میں آکر پناہ گزیں ہوئے ہیں تو انہیں یہاں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سرکش قوتوں کو بدلگام ہونے دیا جائے یا ان کی روک تھام کا کچھ انتظام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ۔ اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش قوتوں کی روک تھام دوسرے لوگوں کے ہاتھوں ہو، تو پھر دنیا میں کوئی امن کی جگہ باقی ہی نہ رہے، حتیٰ کہ مختلف اہلِ مذاہب کی پرستش گاہیں تک مسمار کر دی جائیں — راہبوں کی کوٹھڑیاں۔ یہودیوں کے صومعے، دیگر اقوام کی عبادت گاہیں۔ مسجدیں جن میں خدا کا نام بکثرت لیا جاتا ہے۔ یہ سب ڈھا دی جائیں۔ اس مقصد کے لئے، ایسی جماعتوں کا وجود ضروری ہے جو عندالضرورت اپنی جان تک دے کر لوگوں کی مذہبی آزادی، برقرار رہنے کا انتظام کریں۔ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ (۲۲/۳۹-۴۰)۔ جو جماعت، اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے خدا کی مددگار بنے گی، خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

اسلامی مملکت کی غرض و غایت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعت، جسے سرکش قوتوں کی روک تھام کے لئے جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے، اگر اسے غلبہ حاصل ہو گیا تو اس کا طرزِ عمل کیا ہو گا؟ کیا اس کا غلبہ بھی اسی طرح، کمزوروں اور ناتوانوں کو کچلنے کے لئے ہو گا؟ قطعاً نہیں۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ○ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں تمکن حاصل ہو گیا تو یہ ایسا نظام قائم کریں گے جس میں لوگ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں گے، اور ہر شخص کو سامانِ نشوونما حاصل ہو گا۔ یہ اُن باتوں کا حکم دیں گے جنہیں خدا کا قانون صحیح قرار دے گا اور اُن سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ کہے گا۔ ان کی حکومت

میں، ہر معاملہ کا آخری فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق ہوگا۔ لہذا، اس میں کسی قسم کی سرکشی اور دھاندلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسرے مقام پر کہا گیا کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ اگر اللہ سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا رہے، تو دنیا میں فساد ہی فساد نظر آئے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۲۵۱)۔ لیکن خدا اس طرح اقوام عالم کو تباہ نہیں کرانا چاہتا، اس لئے اس نے ایسی جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اپنا خون دے کر امن عالم قائم رکھیں۔

لہذا، قرآن کریم کی رُو سے، جنگ کی اجازت ان لوگوں کو دی گئی ہے جنہیں سرکش قوتیں کہیں جینے نہ دیں۔ وہ ان قوتوں سے مدافعت کے لئے جنگ کر سکتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان بیچاروں میں اتنی سکت نہ ہو کہ یہ اپنی مدافعت کر سکیں تو پھر کیا ہو؟ کیا اس صورت میں انہیں، اُن جفا جو درندوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ ان مظلوموں اور

مظلوموں کی مدد کیلئے

لاوارثوں کی مدد کی جائے اور اُن کی حفاظت کے لئے عند الضرورت، میدانِ جنگ میں اُتر آیا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جماعتِ مومنین سے کہا جاتا ہے کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ تم سنتے نہیں کہ کمزور اور ناتواں مرد۔ عورتیں۔ بچے کس طرح چلا چلا کر پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندوں نے اس قدر ظلم برپا کر رکھا ہے۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (۴/۷۵)۔ وہ فریاد کر رہے ہیں کہ ہمارے لئے کہیں سے کوئی سرپرست پیدا کر دے۔ کوئی مددگار بھیج دے جو ہمیں ان کے مظالم سے نجات دلائے ۔۔ کیا اُن کی فریاد تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی؟ یا تم نے سمجھ لیا ہے کہ چونکہ اب ہم محفوظ ہو گئے ہیں اس لئے ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ تمہارا مقصدِ زندگی اپنی جان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ دنیا میں ہر مظلوم کی حفاظت ہے۔ ظلم کی روک تھام، تمہارا فریضۂ زندگی ہے۔ اس لئے جہاں سے مظلوم کی آواز اٹھے گی، تمہیں اس کی مدد کے لئے پہنچنا ہوگا۔ یہی جنگ "قتال فی سبیل اللہ" اللہ کی راہ میں جنگ ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (۴/۷۶) جماعتِ مومنین، ظلم کی روک تھام کے لئے، خدا کی راہ میں جنگ کرتی ہے۔ اور جو لوگ حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں، وہ ظلم اور

سرکشی کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے یہاں جنگ کے مقاصد میں اصولی اور بنیادی فرق بتا کر

جائز اور ناجائز جنگ

یہ واضح کر دیا کہ کس مقصد کے لئے جنگ، جائز بلکہ ضروری ہو جاتی ہے، اور کن مقاصد کے لئے ناجائز اور باطل۔ اگر جنگ، ظلم مٹانے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لئے ہو، تو جائز۔ اگر ظلم برپا کرنے کے لئے ہو تو ناجائز۔ ظلم کسے کہتے ہیں، اسے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر نہایت وضاحت سے خود ہی بیان کر دیا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی گروہ، کسی بات کو یونہی ظلم قرار دے کر آمادہ پیکار ہو جائے اور اپنے آپ کو برسرِ حق قرار دے لے۔ قرآن اپنی کسی بات کو مبہم اور وضاحت طلب چھوڑتا ہی نہیں۔ لیکن یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں مختلف مواقع پر بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ اس مقام پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ جن امور کو قرآن "بنیادی حقوق انسانیت" قرار دیتا ہے، کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو ان سے محروم کر دینا، ظلم قرار پائے گا؛ اور اس کی روک تھام جماعتِ مؤمنین کا فریضہ ہو گا، خواہ یہ ظلم کسی پر بھی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں ہو گی۔

یہاں تک سوال، جنگ کی ضرورت۔ مقاصد۔ جواز یا عدم جواز کا تھا۔ اب دیکھئے کہ جنگ کی صورت میں، قرآن، جماعت مؤمنین پر کن شرائط کی پابندی ضروری قرار دیتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ عدل کا

دشمن سے عدل

دامن، جنگ میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جائے گا۔ دشمن سے بھی عدل کیا جائیگا۔ اس کا تاکیدی حکم ہے کہ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (۵/۸)۔ دیکھنا! کسی قوم کی تمہارے خلاف دشمنی، تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ دشمن سے بھی عدل کرو۔ یہی طرزِ عمل تقویٰ سے قریب تر ہے — عدل ظلم کی ضد ہے۔ لہٰذا، جب ظلم کے معنی ہیں، کسی کو انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دینا، تو عدل سے مراد ہو گی، ان حقوق کی حفاظت کرنا۔ بنا بریں قرآن کریم کی رو سے، جنگ کی حالت میں بھی دشمن کو حقوقِ انسانیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا کا عام چلن یہ ہے کہ جنگ اور معاشقہ میں ہر حربہ جائز ہے۔ (EVERY THING IS FAIR IN LOVE AND WAR) لیکن قرآن اسے حدیثِ بے خبراں قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دینا، جنگ میں بھی جائز نہیں۔

اب آگے بڑھئے۔ جنگ ہو یا صلح، ان میں معاہدات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے

معاہدات کی اہمیت کہ دنیا کا امن، معاہدات کے بھروسے پر قائم رہتا ہے۔ معاہدہ باہمی اعتماد کی ضمانت ہوتا ہے۔ لیکن جب اصول یہ قرار دے لیا جائے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے، تو پھر معاہدات کا احترام کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونان کے مشہور مقنن، سولن نے کہا تھا کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو تو پھانس لیتا ہے لیکن قوت والے کے سامنے پرکاہ کی سی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور مغربی سیاست کا امام، میکیاولی یہ تعلیم دیتا ہے کہ

> عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا پیمان اس کے خلاف جاتا ہے۔ یا جن مصلحتوں کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نظر فریب دلائل بھی بہم پہنچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ فریب جس سے مقصد حاصل ہو، قابلِ تعریف ہوتا ہے۔

اور اس امام کے مقتدی، فریڈرک دوم کا قول ہے کہ

> حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمت عملی یہ ہے کہ حسب موقعہ، جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے، اسے اختیار کر لیا جائے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔ اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہیئے۔ اگر کبھی کسی سے معاہدہ کر بھی لیا جائے تو اسے حسب مصلحت توڑ ڈالنا چاہیئے۔

اٹلی کے میکیاولی سے بہت پہلے، بھارت (ہندوستان) میں ایک میکیاولی گزرا ہے جس کا لقب ہی کوٹلیہ (KAUTILYA) — یعنی فریب کار — ہے۔ وہ اپنی کتاب، ارتھ شاستر میں لکھتا ہے کہ

> معاہدات کو وقتی مصلحتوں کے تابع رہنا چاہیئے اور عندالضرورت ان سے بلا توقف پھر جانا چاہیئے۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے کرنا چاہیئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں سے کسی کو تمہاری چال کا علم نہ ہونے پائے۔[1]

ان سب کے برعکس قرآن کریم نے معاہدات کی پابندی پر جس قدر زور دیا ہے، اس پر اس کا ایک ایک متعلقہ

---

[1] ہندوستان، اپنے اس سیاسی گرو کے ارشادات (نصیحت) پر کس طرح حرفاً حرفاً عمل کر رہا ہے؟ اس پر اس کی پندرہ سولہ سال کی سیاسی تاریخ شاہد ہے۔ اور ایک ہندوستان پر ہی کیا موقوف ہے۔ دنیا کا ہر ملک یہی کچھ کر رہا ہے۔

معاہدہ کا احترام

مقام شاہد ہے۔ اس نے اصولی تاکید کی کہ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵/۱)۔ عہد و پیمان کی پوری پوری پابندی کرو۔ دوسرے مقام پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ معاہدہ کرنے کے بعد تم ایفائے عہد کے لئے' صرف اس پارٹی کے سامنے جوابدہ ہو جس کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہے۔ تم اس کے لئے اپنے خدا کے سامنے بھی جوابدہ ہو۔ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴)۔ عہد کی پابندی کرو۔ یاد رکھو! تم سے عہد و پیمان کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قرآن کے ان تاکیدی احکام کی روشنی میں' جماعت مومنین کی طرف سے' معاہدات میں خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فریق مخالف' خیانت پر اتر آئے' تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب عام طور پر یہی دیا جائے گا کہ پھر تم بھی اسی قسم کا طرز عمل اختیار کرو۔ لیکن قرآن کی یہ تعلیم نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً اگر تمہیں کسی پارٹی کی طرف سے عہد شکنی کا خطرہ ہو تو تم انہیں اطلاع دیئے بغیر یونہی معاہدہ کالعدم نہ کر دو۔ فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ۔ تم انہیں اس کی اطلاع دے کر معاہدہ ختم کرو۔ اور اس طرح دونوں فریق برابر کی سطح پر آجاؤ۔ عَلٰى سَوَآءٍ کے یہ معنی بھی ہیں کہ اگر اس طرح یک لخت معاہدہ توڑنے سے انہیں کوئی نقصان پہنچا ہو تو اس کی تلافی کر کے' ان سے مساوات کا سلوک کرو۔ اس لئے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (۸/۵۸) اللہ معاہدات میں خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

عملی مثالیں

ہماری تاریخ کے اس عہد ہمایوں میں' جب قرآنی نظام قائم تھا' کسی بین الاقوامی معاہدہ میں خیانت کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں' انفرادی عہد و پیمان کا بھی کس حد تک احترام کیا جاتا تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ بدر کے میدان میں حالت یہ تھی کہ ادھر تین سو تیرہ' قریب قریب نہتے' اور بے ساز و براق مجاہدین کی صف۔ مقابل میں قریش کا جم غفیر اتنے میں دیکھا کہ دو صحابی' کہیں سے دوڑے دوڑے آئے اور مجاہدین کی صفوں میں شریک ہو گئے۔ اس وقت حالات ایسے نازک تھے کہ اسلامی لشکر میں ایک سپاہی کا اضافہ بھی موجب تقویت تھا۔ مجاہدین کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آ رہے تھے۔ راستے میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کے لئے جا رہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ میدان جنگ تک پہنچ سکے ہیں۔ حضورؐ نے سنا تو فرمایا کہ جب تم نے ان سے جنگ میں عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ فکر نہ کرو۔ ہماری اللہ مدد کرے گا۔

یہ تو پھر بھی ایسے عہد کی پابندی ہے جو، بہ حالات مجبوری ہی سہی، مخالفین سے کر لیا گیا تھا۔ قرآن کریم اس باب میں اس سے بھی دو قدم آگے جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد، ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ بعض عورتیں مسلمان ہو گئیں۔ لیکن ان کے خاوند، ہنوز غیر مسلم تھے۔ ان کفار کی طرف سے ان مسلمان بیویوں پر جو مظالم ہوتے ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ یہ عورتیں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینہ میں آجاتی تھیں۔ اور اس طرح ان کے مظالم سے چھٹکارا حاصل کر لیتی تھیں۔ ان عورتوں کے متعلق قرآن نے کہا کہ انہیں واپس تو نہ بھیجو کیونکہ ان حالات میں، ان مسلم عورتوں کا، ان کفار کے نکاح میں رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا (۶۰/۱۰) انہوں نے ان کے نکاح پر جو کچھ خرچ کیا تھا، وہ انہیں ادا کر دو۔ غور کیجئے! آپ کو ایفائے عہد اور عدل و انصاف کی، اس قسم کی مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟

صلح

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے، جس قوم سے جنگ چھڑ جائے، اس جنگ کو کب تک جاری رکھا جائے؟ قرآن نے کہا ہے کہ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا۔ فریق مخالف جس وقت بھی صلح کی طرف جھکے تم اس کی طرف جھک جاؤ۔ اس وقت یہ نہ کہو کہ ہماری فتح ہونے لگی تھی تو دشمن نے صلح کی درخواست پیش کر دی۔ اب ہم صلح کیوں کریں۔ ہم انہیں مفتوح و مغلوب بنائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انداز نگاہ غلط ہے۔ جنگ سے تمہارا مقصد نہ مالِ غنیمت تھا نہ کشور کشائی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ سرکش قومیں اپنی سرکشی سے باز آجائیں۔ سو وہ جس وقت بھی سرکشی چھوڑ کر، قانون کے سامنے جھک جائیں، تمہارا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد جنگ جاری رکھنے کے معنی کیا ہیں؟ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (۸/۶۲)۔ اگر بفرضِ محال، وہ صلح کی درخواست کی آڑ میں تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہوں، تو تمہیں پھر بھی گھبرانا نہیں چاہیئے۔ قانونِ خداوندی تمہاری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ تم اپنی طرف سے پوری احتیاطی تدابیر اختیار کرو۔ لیکن ان کی صلح کی درخواست کو اس بدگمانی کے ماتحت مسترد نہ کر دو کہ وہ اس باب میں نیک نیتی سے کام نہیں لے رہے۔

جنگ کب تک جاری رکھی جائے

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کے لئے آمادہ نہ ہوں، تو جنگ کب تک جاری رکھی جائے۔ اس کے لئے کہہ دیا کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (۸/۳۹)۔ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ وہ فتنہ فرو ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ جنگ کی گئی تھی، تو جنگ ختم کر دو۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، جنگ سے مقصد فتنہ ختم کرنا تھا۔ لفظ فتنہ کے اندر ہر قسم کی سرکشی۔ استبداد۔ جور و ستم۔ مذہب کے معاملہ میں سختی اور زبردستی سب آجاتے ہیں۔

یہ خواہ صلح کی صورت میں، یا فتنہ فرو ہو جانے کی شکل میں جنگ کا اختتام۔ لیکن قرآن کریم، جنگ کے دوران میں، امن وسلامتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو وجد میں آجاتی ہے۔ جنگ اسی صورت میں جاری رکھی جاسکتی ہے کہ فریقین

جنگ کا التوا

اپنی اپنی قوم اور سپاہیوں کے دل میں، فریق مخالف کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات برابر مشتعل کرتے رہیں۔ اگر کسی طرح جنگ میں دفعۃً پیدا کر دیا جائے، تو جذبات کا یہ اشتعال مدھم پڑ جاتا اور پھر ختم ہی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اس آگ کو بھڑکانا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے، ہمارے زمانہ میں متارکہ (یا CEASE - FIRE) کا طریق وضع کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے آج سے بہت پہلے، متارکہ کے اصول کو قوانین جنگ کے ضابطہ میں داخل کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ بین الاقوامی معاہدہ کی رُو سے، یہ طے کر لینا چاہیئے کہ، سال میں کچھ مہینے ایسے رکھے جائیں گے جن میں جنگ بہرحال ملتوی کر دینی ہوگی، خواہ وہ کہیں بھی ہو رہی ہو، مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (۹/۳۶)۔ سال کے بارہ مہینوں میں چار ایسے ہیں جن میں لڑائی یکسر بند رہے گی۔ ظاہر ہے کہ جب، سال میں کچھ وقت کے لئے لڑائی بہرحال بند ہوگی تو جذبات منافرت وعداوت کی آگ کی شعلہ زنی خود بخود ماند پڑ جائے گی اور یہ فضا قیام امن وصلح کے لئے بڑی سازگار ہوگی۔

جنگ کے قیدی

جنگ کے سلسلے میں ایک اہم سوال جنگ کے قیدیوں کا ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ روش، زمانہ قدیم سے چلی آرہی تھی کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت، عربوں میں یہی رواج تھا۔ چنانچہ ان کے معاشرہ میں، غلام اور لونڈیاں عام ملتی تھیں اور اسے ذرا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے آکر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ کسی انسان کو، غلام بنا لینا، اُسے حقِ انسانیت سے محروم کر دینا ہے جو بہت بڑا جرم ہے۔ اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ۔ جب مخالفین سے تمہارا مقابلہ ہو، تو جیسا کہ جنگ میں ہوتا ہے، ان کی سرکوبی کرو۔ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ۔ پھر جب وہ مغلوب ہو جائیں تو انہیں قید کر لو۔ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴/۴۷) اس کے بعد یا تو انہیں بطور احسان چھوڑ دو۔ اور یا فدیہ لے کر۔ آپ دیکھئے کہ بات کس قدر صاف ہے۔ جنگ کے قیدیوں کو آزاد کرنا ہوگا۔ اگر تمہارے قیدی دشمن کے ہاں ہیں، تو ان کے مبادلہ میں انہیں رہا کر دو، یا کچھ زرِ فدیہ لے کر، اور یا محض احسان کے طور پر انہیں آزاد کر دو۔ بہرحال انہیں آزاد کرنا ہے۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اس

میں آپ دیکھیے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا لینے کا اشارہ تک نہیں - اور ایسا ہو بھی کس طرح سکتا تھا۔ وہ قرآن جو فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳) - یعنی غلاموں کو آزاد کرانے کو جماعتِ مومنین کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ جو جنگ کی ضرورت ہی اس لئے قرار دیتا ہے کہ جن لوگوں کو حقوقِ انسانیت سے محروم کر دیا گیا ہے' انہیں وہ حقوق واپس دلائے جائیں۔ جو واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا غلام اور محکوم بنائے۔ کیا وہ قرآن اس کا حکم دے گا کہ جنگ میں قید ہونے والے انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح بیچا جائے! سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون جب تک جنگ کے قیدی نظامِ اسلامی کی تحویل میں رہیں گے' ان کی حیثیت سرکاری مہمانوں کی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ قیدی ہو کر بھی انسان تو رہتے ہیں' اس لئے انہیں حقوقِ انسانیت سے کسی صورت میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران میں ان سے کس قسم کا سلوک ہوگا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنگِ بدر کے قیدیوں میں ایک شخص ابوعزیز تھا۔ اس کا بیان ہے کہ میں جس انصاری کے گھر میں بطور مہمان رکھا گیا تھا ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح شام کھانا لاتے' تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا' لیکن وہ اسے ہاتھ نہ لگاتے' اور زبردستی مجھے کھلا دیتے۔

انہی قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے' عام مجمعوں میں' نبی اکرمؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس شخص کے سامنے کے دو دانت اکھڑوا دیے جائیں تاکہ یہ آئندہ تقریر کرنے کے قابل نہ رہے۔ لیکن حضورؐ نے اس کی اجازت نہ دی۔

جنگِ بدر کے قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جو ناداری کی وجہ سے زرِ فدیہ نہ دے سکے ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ یہی ان کا فدیہ ہو جائے گا۔ جو ایسا بھی نہیں کر سکتے تھے' انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔ جن سے زرِ فدیہ لیا گیا تھا' ان سے بھی جاتے وقت کہہ دیا گیا کہ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (۸/۷۰) اگر اس کے بعد اس مملکت کے متعلق تمہارے دل میں خیر سگالی کے جذبات پائے گئے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے' تمہیں اس سے بہتر واپس دیا جائے گا اور تمہاری حفاظت کا سامان بھی کر دیا جائے گا۔

"غلامی اور اسلام" ایک مستقل موضوع ہے۔ جس پر تفصیل سے گفتگو کسی دوسرے وقت کی جا سکے گی۔ اس مقام پر ضمناً اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم میں' غلاموں اور لونڈیوں (مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) کے ضمن میں جس قدر احکام اور ہدایات ہیں' وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام احکام ماضی کے صیغے (PAST TENSE)

میں ہیں۔ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ یعنی جو اس سے پہلے غلام بنائے جا چکے تھے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ جنہیں تم اس کے بعد غلام بناؤ' اُن کے متعلق یہ احکام ہیں۔ قرآن نے اُن غلاموں اور لونڈیوں کو جو اس وقت اس معاشرہ میں موجود تھے' آہستہ آہستہ آزاد کرا دیا اور یا انہیں مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا۔ اور اس کے بعد غلامی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ لیکن اس بدقسمتی کا کیا علاج کہ ہمارے ارباب مذہب' اب بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اسلام میں دشمن کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کی اجازت ہے۔ اور اگر اب بھی پاکستان کی جنگ کسی اور ملک سے ہوئی تو ہم ان کے مردوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ

> حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں۔ اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔
>
> (تفہیم القرآن اول - از ابو الاعلیٰ مودودی صاحب۔ صفحہ ۳۴۰)

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

> جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو، بہر حال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصے میں وہ آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔
>
> (تفسیر تفہیم القرآن۔ صفحہ ۳۴۰)

یعنی نکاح تو صرف مسلمان عورتوں سے یا اہل کتاب کی عورتوں سے ہو سکتا ہے' کفار و مشرکین کی عورتوں سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ لیکن جنگ میں گرفتار شدہ لونڈیوں کے لئے یہ بھی شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب سے ہوں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

> جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔

حتیٰ کہ جن لوگوں کے حصے میں یہ لونڈیاں آئیں گی انہیں اس کا بھی اختیار ہو گا کہ استعمال کرنے کے بعد انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ چنانچہ اس باب میں تحریر ہے کہ

> اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو

ان سے فدیہ وصول کر لے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو
حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۳۲۳)

یہ ہے جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں اور ان کی عورتوں کے ساتھ وہ سلوک جسے ہمارے یہ حضرات، اسلام کا منشاء اور حکم قرار دے کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں[1]۔

بہرحال، یہ بات ضمناً سامنے آگئی تھی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے حکم یہ دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دو اور یا بطور احسان۔

پناہ میں آنے والے

یہ تو ان لوگوں کے متعلق ہے جو مغلوب و مفتوح ہو کر گرفتار ہو جائیں۔ لیکن جو لوگ، مسلمانوں کی پناہ میں آنا چاہیں، ان کے متعلق قرآن کا فیصلہ اس کی کشادہ نگہی کی زندہ شہادت ہے۔ آجکل ایک نئی ٹیکنیک رائج ہوئی ہے جسے (BRAIN-WASHING) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو شخص تمہارے قابو آجائے ——— خواہ وہ تمہارے اپنے لوگوں میں سے ہو اور اس کے خلاف کوئی بدگمانی ہو، یا دشمن کا کوئی آدمی ——— اسے دردناک عذاب کی بھٹیوں میں سے اس طرح گزارو کہ اس کے تمام سابقہ خیالات اس کے دماغ سے محو ہو جائیں اور وہ اسی طرح سوچنے لگ جائے جس طرح تم چاہو۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ - اور اگر مخالفین (مشرکین) میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اسے اپنے ہاں پناہ دو۔ پھر اسے قرآن سناؤ۔ اگر قرآن کی تعلیم اسے اپیل کرے اور وہ دل کے کامل اطمینان اور سکون کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہے تو خیر۔ لیکن اگر وہ اس کے بعد چلا جانا چاہے تو اسے روکو نہیں۔ بلکہ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ - اسے، اپنی حفاظت میں، اس کے امن کی جگہ تک پہنچاؤ۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ (۹/۶)۔ اس لئے کہ یہ لوگ جاہل ہیں۔ جانتے نہیں کہ قرآن انہیں کیا مقام دینا چاہتا ہے۔ لیکن قرآن کسی سے زبردستی نہیں منوایا جاتا۔ اس لئے اگر یہ بطیب خاطر قرآن کو ماننا نہیں چاہتے، تو انہیں، اپنی حفاظت میں، ان کے مامن تک پہنچا دو ——— آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن کی تعلیم کس قدر بلند اور انسانیت ساز ہے[2]؟

---

[1] تفصیل ان امور کی، ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں" میں ملے گی۔

[2] قرآن تو پناہ گزین مشرک کے متعلق یہ حکم دیتا ہے کہ اگر وہ قرآن سننے کے بعد اسے برضا و رغبت (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا قرآن کریم جنگ کو انسان کی تمدنی زندگی کے لئے لاینفک قرار

جنگ کا خاتمہ

دیتا ہے یا ایسے معاشرہ کا بھی تصور دیتا ہے جس میں جنگ کا امکان نہ رہے۔ وہ ایسے معاشرہ کا تصور دیتا ہے جو آیت اوپر درج کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب تمہیں حق کی مدافعت کے لئے میدانِ جنگ میں نکلنا پڑے تو دشمن کی سرکوبی کرو۔ اور جب ان کی طاقت ٹوٹ جائے تو بقیۃ السیف کو قید کر لو۔ اور قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دو۔ اس کے بعد حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷/۴)۔ تا آنکہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ قرآن جس جنتی معاشرہ کا تصور پیش کرتا ہے اس میں ہر طرف سے سلاماً سلاماً کی زندگی بخش اور امن افروز صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس میں ہر انسان، دوسرے انسان کی سلامتی کا آرزومند ہوتا ہے۔ وہ ایسی انسانیت ساز فضا کس طرح پیدا کرتا ہے جس میں جنگ کا خدشہ تک نہ ہو ایک الگ موضوع ہے جو تفصیل چاہتا ہے۔ اسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا سکتے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ وہ اُن غیر فطری حدود و خطوط کو مٹا کر جن کی بنا پر انسان مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ رہا ہے، تمام انسانوں کی ایک عالمگیر برادری متشکل کر دینا چاہتا ہے اور اس کی بنیاد ایک مشترکہ آئیڈیالوجی قرار دیتا ہے جسے دنیا کا ہر انسان علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرے۔ جب تک ایسی فضا پیدا نہ ہو، وہ ان سرکش قوتوں کے مقابلہ کے لئے، جو دوسروں پر ظلم کریں، جنگ کو ناگزیر قرار دیتا ہے —— خواہ یہ ظلم جماعتِ مومنین کے خلاف ہو، یا دنیا کے کسی اور انسان یا انسانوں کے گروہ کے خلاف۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے جنگ کا مقصود، دنیا سے ظلم مٹا کر اس کی جگہ نظامِ عدل و احسان قائم کرنا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ترمذی کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق کے سامنے جھکا دیا جائے۔ اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ سے پوچھا

اس کی عملی شکل

گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص بہادری کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص ذاتی انتقام کے لئے لڑتا ہے۔ ان میں سے کس کا جہاد صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) تسلیم نہ کرنا چاہے تو اسے کچھ نہ کہو۔ اسے اپنی حفاظت میں، اس کے ہاں پہنچا دو۔ اس کے برعکس ہمارے ارباب شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایک سفہانی ان باتوں سے مطمئن نہ ہو جنہیں وہ اسلام کہہ کر منوانا چاہتے ہیں، اور اس لئے وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ تو اسے قابلِ قتل کر دیا جائے۔ (اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں)۔

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَاءَ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

جو اس لئے لڑتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون غالب رہے، اس کی جنگ اللہ کی راہ میں ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین صرف اپنے گروہ کے مفاد کا تحفظ کرتے ہیں۔ اور چونکہ انسان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے باہمی مفاد میں تصادم ہوتا ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ خدا رب العالمین۔ تمام انسانوں کا یکساں نشوونما دینے والا ہے، اس لئے اس کے عطا کردہ قوانین کی رو سے، تمام انسانوں کے مفاد کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر امنِ عالم کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اس بنیاد کو توحید کہا جاتا ہے — یعنی تمام انسانوں پر ایک خدا کے قوانین کا اقتدار۔ جو نظام اس بنیاد پر متشکل ہوتا ہے، اسے قرآن کریم دین کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی تمام انسانوں کے لئے ایک نظامِ زندگی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس اب رفتہ رفتہ، خود مغرب کے مفکرین کو بھی ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً پروفیسر الفریڈ کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں، عصرِ حاضر کے ہمہ گیر اضطراب پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد آخر میں لکھتا ہے کہ

> دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آ رہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔

مسٹر ایمری ریوز (EMREY REVES) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

> کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح، جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیئے جن پر یہ اقتدار قائم ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیئے تاکہ یہ مقصود خون ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔ (ANATOMY OF PEACE)۔

یہ خیال اب دنیا کے چیدہ چیدہ مفکرین تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر (W. A. GAULD) نے اپنی کتاب (MAN, NATURE & TIME) میں کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا کہ

> مجھے تسلیم ہے کہ "گھر اور وطن" کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ایک عالمگیر انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے۔

.......اگر اب تک اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس پورے زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا، اس لئے اس کے متعلق زیادہ حسنِ ظن قبل از وقت ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت کہ کم و بیش ہر ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہا ہے، اس امر کی ضمانت ہے کہ کچھ وقت کے بعد، یہ خیال عملی شکل اختیار کر لے گا۔

اگر اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا، تو اس کی ذمہ دار (فلہذا، انسانیت کی بارگاہ میں مجرم) وہ قوم ہے جسے اس عالمگیر نظام کا تصور، آج سے چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا۔ قرآن نے اُس زمانے میں کہا تھا کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (۲/۲۱۳)۔ انسانی معاشرہ کی آخری شکل یہی ہوتی ہے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری بن جائیں۔ اس کے علاوہ، دنیا میں امن و سلامتی کی کوئی صورت نہیں۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے تمام نوعِ انسان کے لئے دین ——— یعنی نظامِ زندگی ——— بھی ایک تجویز کیا گیا۔ قرآن سے پہلے، مختلف انبیاء کرامؑ، کسی خاص قوموں کی طرف آتے تھے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہوا کہ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (۷/۱۵۸)۔ ان سے کہدو کہ میں تمام نوعِ انسان کی طرف رسول ہوں۔ یہی وہ بنیاد ہے، جس پر انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ خود قرآن کریم کے متعلق بھی کہا گیا کہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰/۵۷)۔ اے ساری دنیا کے انسانو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آ گیا ہے جس میں تمہاری تمام الجھنوں کا علاج ہے۔ انسانی مشکلات کا علاج یہی ہے کہ تمام انسان ایک برادری کی شکل میں زندگی بسر کریں اور اس کا طریق یہ ہے کہ ان سب کا ضابطۂ قوانین ایک ہو۔ یہ تھا وہ تصورِ حیات جو امتِ مسلمہ کو چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا، لیکن اس نے اس تصور کو اس طرح پسِ پشت ڈال رکھا ہے کہ آج جبکہ دنیا کی دیگر اقوام کے دل میں یہ خیال، کسی نہ کسی انداز سے۔ کروٹیں لے رہا ہے، یہ اس سے اس طرح بے بہرہ ہے گویا اس کی آواز تک کبھی اس کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔ لیکن قرآن کے ان تصورات پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری تھوڑی ہے کہ کوئی دوسرا ان میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ تو سورج کی روشنی کی طرح، فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس کا جی چاہے ان سے بہرہ یاب ہو جائے۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

پاکستان کا خطۂ زمین اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہ اس عالمگیر نظامِ انسانیت کا اولین گہوارہ

بنے اور یہاں سے اس شجر طیب کی شاخیں پھوٹیں جو دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں پر امن و سلامتی کا سایہ کریں۔

اس نظام کا گہوارہ

یہی وہ نظام تھا جس کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ مَنْ دَخَلَہٗ کَانَ آمِنًا (۳/۹۶)۔ جو اس میں داخل ہو گیا، اسے امن نصیب ہو جائے گا۔ اور جس کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ قِیَامًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷)۔ یہ انسانیت کے قیام کا باعث ہے۔ یہی وہ امن عالم کی ضمانت دینے والا نظام ہے کہ اگر سرکش قوتیں، عالمگیر مفادِ انسانیت کے خلاف، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اس کے قیام کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جائیں، تو انہیں راستے سے ہٹایا جائے اور اس کے لئے اگر جنگ ناگزیر ہو، تو اسے اسی طرح روا رکھا جائے جس طرح، ڈاکٹر ایسی انگلی کو مجبوراً کاٹ ڈالتا ہے جس کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہو، اور جس کا زہر سارے جسم میں سرایت کئے جا رہا ہو۔ قرآن قوت کے استعمال کی اسی مقصد کے لئے اجازت دیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے ۔۔۔ صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے ۔۔۔ عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر ۔۔۔ ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

"دین کی حفاظت" سے مراد یہی عالمگیر انسانیت کے نظامِ امن و سلامتی کی حفاظت ہے۔ اسلام میں اسی مقصد کے لئے جنگ کی اجازت ہے۔ جو جنگ، استبداد اور جوع الارض کی تسکین کے لئے کی جائے، وہ جنگ حرام ہے۔

صلح شر گردد چو مقصود است غیر ۔۔۔ گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند ۔۔۔ جنگ باشد قوم را نا ارجمند

(اقبالؒ)

مفکرِ قرآن پرویز صاحب کی تحقیق مسلسل و کاوشِ پیہم کا بے مثال شاہکار

انسان نے کیا سوچا؟

عہدِ افلاطون سے لیکر عصرِ حاضر تک انسانی فکر کن دشوار گذار مرحلوں کو طے کرتی ہم تک پہنچی ہے۔ ایک عبرت آموز روئیداد۔ ایک علم افروز داستان۔ ایک بصیرت انگیز تجزیہ

ممتاز جرائد کا خراجِ تحسین

فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین کیلئے قابلِ مطالعہ نہیں بلکہ اس کی افادیت اور مرکزیت کے پیشِ نظر کالجوں کے طلباء کیلئے اس کا مطالعہ زیادہ ضروری ہونا چاہیئے — نوائے وقت لاہور

یہ کتاب نوجوانوں کیلئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے

قیمت بارہ روپے

[illegible] صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے ([illegible])

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۷ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

حقائق و عبر

۱۔ مریم پاگل نہیں ہوئی

"لاہور۔ ۲۸ مئی (اسٹاف رپورٹر) امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ان افواہوں کی تردید کی ہے کہ کچھ عرصہ پیشتر جو امریکی خاتون (مریم) مسلمان ہوئی تھی وہ پاگل ہو گئی ہے۔ آپ نے بتایا کہ اسے ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں، اور وہ ذہنی عوارض کے باعث ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ آپ نے کہا "ابھی اگلے دن مجھے اس کا ایک خط ملا ہے جو اس نے ہسپتال سے لکھا ہے۔ اس خط کا نفس مضمون اور انداز اتنا منطقی اور مدلل ہے کہ ایک عام آدمی سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ خط سے ذہنی توازن بگڑنے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ مولانا مودودی نے امید ظاہر کی ہے کہ دس پندرہ روز تک یہ خاتون صحتیاب ہو کر آ جائے گی تو اس کی رہائش کے لئے علیحدہ مکان کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ مولانا نے بتایا کہ یہ خاتون پکی مسلمان ہے اور وہ اسلامی معاشرہ اختیار کرنے کے لئے مسلمان ہوئی ہے۔ وہ کسی پکے مسلمان سے شادی کرانے کی متمنی ہے۔"

(نوائے وقت۔ ۲۹ مئی ۱۹۶۳ء)

نوائے وقت کی اس رپورٹ میں ہمارا بھی تھوڑا سا حصہ ہے اور وہ یہ کہ ہم نے چند ٹکڑوں کو خط کشیدہ بنا دیا ہے اور اس طرح رپورٹ اور تبصرہ بیک وقت سامنے آ جاتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

"وہ پاگل نہیں ہوئی"

"وہ ذہنی عوارض کے باعث ہسپتال میں زیر علاج ہے"

ہم ممنون ہوں گے اگر کوئی صاحب یہ بتا دیں کہ پاگل پن ذہنی عارضہ نہیں ہوتا تو اور کیا ہوتا ہے؟ مولانا صاحب غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ پاگل اسی کو کہتے ہیں جو بازاروں میں لوگوں پر اینٹ پتھر مارتا پھرتا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ پاگل پن کی بیشمار قسمیں ہیں اور اس کے اظہار کی مختلف شکلیں۔ لیکن ان سب کی بنیاد ایک ہی ہوتی ہے۔ یعنی ذہنی عارضہ ——

مولانا صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ اس خاتون کا جو خط انہیں حال ہی میں موصول ہوا ہے اس کا انداز بیان اس قدر منطقی ہے کہ اس سے ذہنی توازن بگڑنے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ بے شمار پاگل ایسے ہوتے ہیں کہ آپ صبح سے شام تک ان سے باتیں کیجئے۔ ان میں آپ کہیں بے ربطی اور عدم توازن محسوس نہیں کر سکیں گے۔ وہ ہزار سیانوں کے ایک سیانے نظر آئیں گے۔ لیکن جب ان پر مرض کا دورہ پڑے گا ——— اور ہو سکتا ہے کہ وہ چند منٹوں کے لئے ہی ہو ——— اس وقت معلوم ہوگا کہ ان کے ذہنی توازن کی کیا کیفیت ہے۔

پھر مولانا نے اپنے بیان میں وہ پردہ ڈالا ہے کہ اٹھائے نہ بنے۔ کاش وہ یہ بھی بتا دیتے کہ یہ خاتون کس "ہسپتال" میں زیر علاج ہیں؟ ہم نے سنا ہے کہ وہ پاگل خانہ میں ہیں۔

ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے وہ محض ضمنی ہے۔ جس مقصد کے لئے ہم نے اس واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھا ہے وہ کچھ اور ہے اور وہی درحقیقت اہم ہے۔

ہماری اس واجب الاحترام عزیزہ (مریم) نے صنم کدۂ امریکہ میں اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ حساس تھی۔ سکون کی متلاشی تھی۔ وہ سکون اسے نہ اپنے آبائی مذہب (یہودیت) میں ملتا تھا نہ امریکہ کے معاشرہ میں ——— اس تلاش نے اسے اسلام کی بارگاہ تک پہنچایا اور اس طرح وہ نظری طور پر اس دین حقہ سے متعارف ہوئی جس نے انسانیت کو امت واحدہ قرار دیا ہے۔ جس نے ہر انسان کو یکساں واجب التکریم ہونے کا اعلان کیا ہے۔ جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر فرد کو حقیقی آزادی عطا کرتا ہے۔ اسے شرف انسانیت سے بہرہ ور ہونے کا راستہ بتاتا ہے۔ وہ غلامی کے داغ کو انسانیت کی پیشانی سے دھو دیتا ہے۔ وہ عورت کو معاشرہ میں وہ مقام عطا کرتا ہے جس سے اسے مردوں کے استبداد نے قرنہا قرن سے محروم کر رکھا ہے۔ مریم اس تعلیم کی جاذبیت سے کھنچ کر اسلام کے آغوش میں آ گئی۔ اب وہ ایک ایسے معاشرہ میں اپنی حیات ارضی کے باقی ماندہ دن گزارنے کے لئے بے چین و مضطرب تھی جہاں اسلام کی یہ اقدار عملاً متشکل ہوں۔ جہاں اسے وہ حقیقی آزادی حاصل ہو جو اس کے لئے اسلام قبول کرنے کی بنیادی وجہ بنی تھی۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اسے اس مقصد کے لئے پاکستان اور اس میں جماعت اسلامی کے معاشرہ سے کس نے متعارف کرایا۔ بہرحال اس نے اس جذبہ کے ماتحت اپنے گھر کو چھوڑا۔ ان گلیوں کو چھوڑا جہاں اس کا بچپن اور اس کے بعد عمر کا کافی حصہ گزرا تھا۔ اس نے اس دیس سے منہ موڑا جس سے اس کی زندگی کی کتنی ہی معصوم یادیں وابستہ تھیں۔ اور یوں اس نے ہجرت کی ——— سچ مچ ہجرت ——— وہ اللہ کے راستے میں نکلی اور نہ معلوم کیسی کیسی حسین تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کی شمعیں اپنے دل میں روشن کئے پاکستان کی طرف آئی۔

امراض دماغی کے معالج یقیناً ہم سے اتفاق کریں گے کہ پاگل ہونے والوں کی اکثریت بے حد حساس افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب وہ کشمکش ہوتی ہے جو فرد کے تصورات اور معاشرے کے عملی نقشہ میں تضاد

کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مریم آئی تھی ان تصورات کو لئے ہوئے لیکن یہاں پہنچ کر جس قسم کی فضا ملی اس میں اس کشمکش کا پیدا رہونا لاینفک تھا۔

پاکستان میں قدم رکھتے ہی اسے برقع سے نوازا گیا اور وہ جو آزاد فضاؤں میں پلی تھی اور جس کی فطری عصمت حیا اور پاک دامانی نے اسے حصارِ عفت یعنی اسلام میں داخل کیا تھا اسے یہ رسمی برقع کفن کی طرح اوڑھا دیا گیا —— اور چونکہ اس سے کہا گیا کہ یہ دین کا تقاضا ہے، اس لئے اسے یہ اوڑھنا پڑا۔ اوڑھنے کو تو اس نے اوڑھ لیا، لیکن اس سے جو نفسیاتی کیفیت اس کے اندر پیدا ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ علمائے نفسیات لگا سکتے ہیں۔

مریم کو مصوری سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس کی تخلیقی قوتوں نے اپنے نکاس کے لئے یہ راستہ چنا تھا۔ وہ اپنے جذبات و محسوسات، اور خیالات و تصورات کا اظہار خطوط اور رنگوں کے ذریعہ کرتی تھی۔ یہاں اسے برقع اوڑھانے کے بعد یہ بتایا گیا کہ اسلام میں مصوری کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ کاش! بے زبان۔ سادہ لوح اور اسلام سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کا جذبہ رکھنے والی مریم، کہنے والوں سے یہ پوچھ سکتی کہ جس خالقِ کائنات کا ایک صفاتی نام "المصور" بھی ہے جس کے عظیم کینوس کا ایک ٹکڑا آب و خاک کی یہ حسین جنت ہے جس کا ایک عظیم المرتبت رسول (حضرت سلیمانؑ) نادرہ کار فنکاروں سے "تماثیل" بنوایا کرتا تھا —— وہ خدا مصوری کو کس طرح حرام قرار دے سکتا ہے۔

باایں ہمہ اگر ان حضرات کے نزدیک واقعی اسلام میں مصوری کی کوئی گنجائش نہ تھی تو ان کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ پہلے مریم کو اس سطح تک پہنچایا جاتا جہاں اس کی تخلیقی قوتیں کسی اور منفذ (OUT - LET) کو پالیتیں تو اسے پھر اس سے روکا جاتا —— لیکن جن حضرات کا اسلام ڈنڈے کے علاوہ کچھ اور جانتا ہی نہ ہو ان سے اس قسم کے انسانیت ساز انداز کی توقع کرنا عبث ہے۔ یہ دوسرا نفسیاتی خناق تھا جس سے اس بے چاری کو دوچار ہونا پڑا۔

اس کشمکش کے گرداب میں الجھی ہوئی اس بدقسمت بچی کی ذہنی مشکلات کا یہ ہفت خواں یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ سوئے اتفاق کہ یہ وہی زمانہ تھا جب عائلی قوانین کے خلاف مذہبی حلقوں کا احتجاج "حرکتِ مذبوحی" میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اب مریم تھی اور چاروں طرف اس قسم کی آوازیں کہ

"چار سال کی بچی کا نکاح بھی اس کا ولی کرا سکتا ہے۔"

"ہر مرد جس وقت بھی چاہے، چار تک عورتیں اپنے نکاح میں لا سکتا ہے۔"

"مرد جب جی چاہے بغیر کوئی وجہ بتائے عورت کو طلاق دے سکتا ہے۔ لیکن عورت کو مرد کے مظالم سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہزار مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔"

"عورت اگر مرد کی بات نہ مانے تو مرد اسے پیٹ بھی سکتا ہے۔"

"نکاح کا مقصد مرد کے جنسی جذبہ کی تسکین اور افزائش نسل ہے۔ ایک مرد کئی عورتوں سے بیک وقت

جنسی تعلقات قائم کر کے انہیں حاملہ کر سکتا ہے۔ لیکن ایک عورت کئی مردوں سے تعلق کے بعد بھی ایک ہی بچہ جن سکتی ہے ۔"

بات یہاں بھی کب ختم ہوئی۔ اس کے سامنے پھر سنگین تر مسئلہ آیا —— لونڈیوں اور کنیزوں کا مسئلہ —— اس نے دیکھا کہ اسے جس آستانے میں جگہ ملی ہے وہاں کے درویش اس لئے غازی بننے کی تمنا کرتے ہیں کہ جہاد میں لونڈیاں ہاتھ آتی ہیں جن سے بلا قید تعداد جنسی تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے بعد جب جی چاہے انہیں دوسروں کے ہاتھوں بیچا جا سکتا ہے۔

مریم اس نظام کو چھوڑ کر نئے نظام کی تلاش میں نکلی تھی جہاں انسان سرمایہ داری کا صید زبوں ہے وہ انسانی روح کی اس غلامی کے خلاف بغاوت کرنے نکلی تھی اسے کیا معلوم تھا کہ وہ ایک ایسے نظام کے داعیوں کے چنگل میں جا پھنسے گی جہاں روح بھی غلام ہے اور جسم بھی غلام۔ اور اس غلامی سے رہائی کی کوئی شکل نہیں۔ اس لئے کہ اگر اسے یہودیت سے سکون نہیں ملا تھا تو وہ بلا تردد اس مذہب کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر سکتی تھی۔ لیکن یہاں پہنچ کر اسے بتایا گیا کہ اگر وہ اس "اسلام" کو چھوڑنا چاہے جس نے اسے اس ذہنی کشمکش میں گرفتار کر دیا ہے تو وہ مرتد ہو جائے گی اور مرتد کی سزا موت ہے۔

اب یہ ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے کہ جب یہ خاتون صحت یاب ہو کر آ جائے گی تو "اس کی رہائش کے لئے علیحدہ مکان کا بندوبست کر دیا جائے گا"! کیا مولانا نے اس کی ذہنی علالت کے ایک سبب کو سمجھ لیا ہے؟

اللہ غنی! کبھی مسلمانوں کے درمیان چند دن گزار کر انسانیت کش معاشرہ کے ڈسے ہوئے ذہن اپنے "عوارض" سے نجات پا لیتے تھے اور آج "قرب صالحین" کا نتیجہ "ذہنی عوارض" ہیں۔!

امیر جماعت اسلامی کے بیان کا آخری ٹکڑا یہ ہے کہ

"مریم کسی پکے مسلمان سے شادی کرانے کی متمنی ہے۔"

کاش یہ تولے وقت کے کاتب کا سہو ہو کر "شادی کرنے" کی جگہ اس نے "شادی کرانے" لکھ دیا ہو۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ ہماری یہ عین اسلامی تمنا بھی محض ایک تمنا ہے اور دین مُلا کی سخت گیری اسے پاش پاش کر کے رکھ دے گی غریب مریم اپنے لئے شوہر کا انتخاب بھی خود نہیں کر سکتی۔ یہاں بھی حق انتخاب اس کے ولی کے حق میں محفوظ ہے۔

ہم نے بیچاری مریم کی اس داستان کا تذکرہ اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ جو حضرات اس کا علاج یا تیمارداری کر رہے ہیں انہیں ان اسباب کا علم ہو جائے جو اس کے "ذہنی عوارض" کا موجب ہیں۔ تاکہ اس سے ان کے علاج میں مدد مل سکے۔

اور یوں دیکھئے تو یہ المیہ ایک مریم بیٹی کا المیہ نہیں۔ کتنی ہی مریم بیٹیاں مذہب کی صلیب پر لٹکی ہوئی ہیں۔ اور اس طرح کہ نہ وہ مردہ ہیں نہ زندہ۔ شادی سے پہلے مجرموں کی سی زندگی —— اور شادی کے بعد ہر وقت یہ دھڑکا کہ

اب چھری صیاد نے لے لی اب کہ در کھلا

اسلام کی بدنصیب بیٹیو! اس دن کا انتظار کرو جب آدم کے بیٹے شمع قرآنی کی روشنی میں فطرت کے اس نوشتے کو پڑھ سکیں کہ

درخط سیاہ کے تو، تقدیر ماست

۲- علمائے ہند اور اسلامی مملکت

اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۰ اپریل کی اشاعت میں اسرار احمد آزاد صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کی جلی سرخیاں یہ ہیں:-

"علمائے اسلام اور دارالعلوم دیوبند کا جنگ آزادی میں حصہ"

"یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں "سلطنت اسلامیہ" کے لئے کوشاں رہے۔

اس مقالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ علمائے دیوبند کے پیش نظر کبھی بھی یہ مقصد نہیں رہا کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کی جائے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ جمہوری انداز کی سیکولر حکومت کا قیام رہا ہے۔ چنانچہ اس باب میں صاحب مقالہ لکھتے ہیں کہ

> دارالعلوم دیوبند کے ساتھ تعلق رکھنے والے علمائے آزاد ہندوستان کی جو پہلی جلاوطن حکومت کابل میں قائم کی تھی اس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو مقرر کیا تھا جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد پچاس سال کی مدت میں حالات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ان کے ماتحت دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علمائے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی اور ان حضرات کے نزدیک اسلام کا تصور کیا ہے۔ یعنی ایک ایسا معاشرہ جس میں مسلمانوں کے پرسنل لاز (شخصی قوانین) علماء کے ہاتھوں میں رہیں اور ملک کا قانون مذہب سے آزاد ہو! یہ ہے وہ تعلیم جو ہماری دینی درسگاہوں میں دی جاتی ہے۔ سوچئے کہ جب تک پاکستان میں ان علمائے کرام کا اقتدار رہے گا اس وقت تک یہاں اسلامی انداز کی حکومت قائم ہونے کا کوئی بھی امکان ہے؟

۳۔ جمعہ کی چھٹی

جب قوموں کے پیشِ نظر زندگی کا بلند نصب العین ہوتا ہے تو وہ اپنے اہم اجتماعی مسائل کا حل تلاش کرنے میں مصروفِ تگ و تاز رہتی ہیں۔ لیکن جب ان کے سامنے کوئی نصب العین نہ ہو تو وہ یوں ہی فروعی باتوں کے پیچھے وقت ضائع کرتی رہتی ہیں۔ وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۔ (۱۸/۱۰۴) اور بزعم خویش سمجھتی یہ ہیں کہ ہم بڑے کارنامے سرانجام دے رہی ہیں۔ یہی حالت ہماری ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی کا ہر مسئلہ ایسا ہے جو قوم کی پوری توجہ اور سعی و عمل کا محتاج ہے۔ لیکن قوم کے "ارباب فکر و نظر" جو مذہبیت سے خاص شغف رکھتے ہیں اس قسم کے مسائل کے حل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں کہ رمضان شریف میں شراب خانے بند رکھنے چاہئیں (سال کے گیارہ مہینے صلائے عام ہونی چاہیئے!) شب برات کی تقریب پر کھانڈ کا کوٹہ زیادہ ملنا چاہیئے۔ نوٹوں پر تصویریں نہیں چھپنی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہی مہمات مسائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دفاتر میں ہفتہ واری چھٹی اتوار کے بجائے جمعہ کو ہونی چاہیئے۔ چنانچہ یہ سوال اکثر و بیشتر مجالس قوانین ساز میں اٹھایا جاتا ہے۔

ہفتہ واری چھٹی کاروباری دنیا کی ایک رسم ہے۔ اور اچھی رسم ہے۔ یہ چھٹی کس دن ہونی چاہیئے اسے کاروباری مصلحتوں کے مطابق طے ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سوال کو مذہبی اہمیت دے کر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ "اسلامی حکومت" میں یہ چھٹی جمعہ کے دن ہونی چاہیئے۔ دین کے نقطۂ نگاہ سے اس سوال کو کوئی اہمیت ہی نہیں کہ ہفتہ واری چھٹی کس دن ہونی چاہیئے۔ لیکن جہاں تک جمعہ کا تعلق ہے۔ قرآن کریم اسے کاروبار کا دن بتاتا ہے نہ کہ چھٹی کا۔ سورۂ جمعہ میں ہے، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۔ اے ایمان والو جب جمعہ کے دن صلوٰۃ کے لئے بلایا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ کر آؤ اور کاروبار چھوڑ دو۔ اس سے واضح ہے کہ جمعہ کے دن نماز سے پہلے لوگ کاروبار میں مصروف رہتے تھے اور قرآن نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ اس کے بعد ہے فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ ۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور تلاش معاش کرو۔ (۶۲/۱۰) یعنی نماز کے بعد بھی کاروبار کی مخالفت نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جمعہ کے دن کاروبار کی مخالفت نہیں۔ صرف اجتماع صلوٰۃ کے لئے اکٹھا ہونے کا حکم ہے۔ لہٰذا مذہبی نکتۂ نگاہ سے جمعہ کی چھٹی کا مطالبہ کوئی وزن نہیں رکھتا۔ یہ یہودیوں کا تصور تھا کہ سبت کے دن کوئی کاروبار نہ کیا جائے۔ قرآن نے جمعہ کے دن کاروبار کی ممانعت نہ کرنے سے یہودیوں کے اس تصور کو غلط قرار دیا ہے۔

۴ - ثقافتی اداروں کی مدد

حکومتِ مغربی پاکستان کے بجٹ میں ادبی اور ثقافتی اداروں کی امداد کے لئے کچھ رقوم مختص کی گئی ہیں۔ ایسا ہر سال ہوتا ہے اور غالباً مرکزی حکومت کے بجٹ میں بھی اس قسم کی گنجائش رکھی جاتی ہے۔ امسال صوبائی حکومت کے بجٹ میں حسب ذیل اداروں کے لئے امدادی رقوم رکھی گئی ہیں۔

مجلس ترقی ادب (لاہور)	دو لاکھ روپیہ
بزم اقبال (لاہور)	۲۵ ہزار روپیہ
اردو اکادمی (لاہور)	پچاس ہزار روپیہ
ادارہ ثقافت اسلامیہ (لاہور)	۲۵ ہزار روپیہ
پنجابی (ادبی) اکادمی	پچاس ہزار روپیہ
پاکستان آرٹس کونسل	پچاس ہزار روپیہ
شاہ عبداللطیف یادگار کمیٹی	پندرہ ہزار روپیہ
انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ڈیپارٹمنٹ	پچاس ہزار روپیہ
بھٹ شاہ کلچر سنٹر	بائیس ہزار روپیہ
اباسین آرٹ سوسائٹی (پشاور)	دس ہزار روپیہ
سندھ ادبی بورڈ (حیدرآباد)	ایک لاکھ روپیہ
پشتو اکادمی (پشاور)	ایک لاکھ روپیہ
اقبال اکادمی (کراچی)	آٹھ ہزار روپیہ
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس	ایک ہزار روپیہ

(بحوالہ نوائے وقت - مورخہ ۱۱ جون سنہ ۱۹۶۳ء)

بے شک ادب و ثقافت کی ترویج و ترقی کے لئے حوصلہ افزائی اور امداد مستحسن اقدام ہے اور ایسا ضرور ہونا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ امداد کسی فرد کا ذاتی عطیہ نہیں جس سے قوم کو کوئی واسطہ نہ ہو۔ یہ امداد قوم کے روپے سے دی جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ قوم کو معلوم ہو کہ جن اداروں کو امداد دی جاتی ہے ان کی کارگزاری کیا ہے۔ وہ ادب و ثقافت کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ اس سے قوم کی کیا خدمت ہوتی ہے۔ ہم حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ قوم کی اطلاع کے لئے یہ بتائے کہ ان اداروں کو اس وقت تک کس قدر امداد دی جا چکی ہے اور ان اداروں نے کیا خدمات سرانجام دی ہیں۔

یہ اس لئے ضروری ہے کہ ایسا نہ ہو کہ حکومت مسلسل امداد دیتی رہے۔ اور بعد میں جب کسی ذمہ دار گوشے سے استفسار کیا جائے تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جائے کہ

من ازیں بیش ندانم کہ کفن وزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند!

---

۵ - قومی ملکیت

نوائے وقت مورخہ ۱۳ رجون سنہ ۱۹۶۳ء میں شائع شدہ ایک خبر۔

" جامعہ ازہر کے ریکٹر شیخ محمود شلطوت نے اس نظریہ کی حمایت کی ہے کہ اسلام، حکومت کو تمام نجی جائداد قومیانے کی اجازت دیتا ہے۔ "اسلامی سوشلزم" نامی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جدید سوشلزم کے تمام بنیادی اصول موجود ہیں اور انسان کا فرض ہے کہ ان تمام اشیاء کی تیاری کا علم حاصل کرے جو معاشرہ کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔۔۔۔ قرآن کریم کا کہنا ہے کہ تمام دنیاوی اشیاء خداوند کریم نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہیں تاکہ دنیا کو زیادہ سے زیادہ قابل قدر بنایا جاسکے۔ تمام اشیاء اللہ کی ملکیت ہیں اور ان کے دنیاوی مالک، درحقیقت ان کے منتظم ہیں۔ جو کہ ان کو محض خدائی احکام کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں۔ شیخ محمود نے انفرادی حق ملکیت کے متعلق بتایا کہ فرد کی دولت تمام افراد کے زیر تحفظ ہے اور تمام افراد کی ضروریات پوری کرنی چاہئیں۔۔۔۔ شیخ شلطوت نے مذہب اور سوشلزم کی مماثلت کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام، حکومت اور عوام کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔ اور چند مٹھی بھر سرمایہ داروں کو حکومت پر قبضہ کر کے عوام کے استحصال کی اجازت نہیں دیتا۔ شیخ محمود شلطوت آج کل تمام دنیا میں اسلامی قانون و فقہ کے ماہر مانے جاتے ہیں۔"

یہ ہیں جامعہ ازہر کے ریکٹر کے خیالات، جائدادوں کی قومی ملکیت کے متعلق۔ اس کے برعکس مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو تمام اصلاح طلب عناصر کو صاف صاف سمجھ لینی چاہیئے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے ہی قدم پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے۔

(مسئلہ ملکیت زمین - ص۳۲)

طلوعِ اسلام کا اس باب میں مسلک یہ ہے کہ مملکت کے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکومت ذرائع پیداوار کا جو انتظام مناسب سمجھے کر سکتی ہے اگر وہ اس مقصد کے لئے ان ذرائع کو اپنی تحویل میں لینا چاہے تو اس میں بھی کوئی ممانعت نہیں۔ قرآن کی رو سے ان ذرائع پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ذرائع پیداوار مخلوق کی زندگی اور پرورش کے لئے ہیں نہ کہ ذاتی جائدادیں کھڑی کرنے کے لئے جیسا جامعہ ازہر کے ریکٹر شیخ محمود شلتوت صاحب نے کہا ہے۔ خدا کرے کہ اسلامی ممالک کی سمجھ میں قرآن کریم کا معاشی نظام آ جائے اور وہ اسے عملاً رائج کر کے مغرب کے نظام سرمایہ داری کے جذام اور روس کی اشتراکیت کے سرسام سے نجات حاصل کر سکیں۔ مسلمانوں ہی کی نہیں۔ ساری دنیا کی نجات کا راز قرآن کے معاشی نظام میں پوشیدہ ہے۔

علمائے کرام کا اسلام

اس عنوان کی شق ۱۳ میں بتایا جا چکا ہے کہ علمائے کرام کے نزدیک اسلام کی صحیح شکل یہ ہے کہ مملکت کا نظام سیکولر ہو اور پرسنل لاز ان حضرات کی تحویل میں رہیں۔ ہم یہ لکھ چکے تھے کہ ۱۳ جون کا اخبار وصل دہلی موصول ہوا جس میں جمعیت العلماء ہند کے اکیسویں اجلاس عام کی روداد شائع ہوئی ہے اس میں لکھا ہے۔

> آج دن میں مجلس مضامین نے جو تجاویز پاس کیں انہیں رات کو جلسہ عام میں پڑھ کر سنایا گیا۔ ان تجاویز میں خاص طور پر قابل ذکر اور اہم تجویز مسلم پرسنل لاز میں مجوزہ ترمیم کے متعلق تھی ......
> اس کی تائید میں مولانا محمد قاسم نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ مسلمانانِ ہند کسی قیمت پر بھی اپنے مذہبی معاملات میں سرکاری مداخلت کو برداشت نہیں کریں گے۔ آپ نے کہا ہم جیلوں کو بھر دیں گے لیکن ہرگز اس بات کو برداشت نہ کریں گے کہ موجودہ مسلم پرسنل لا میں کوئی ترمیم ہونے پائے۔ آخر میں مولانا موصوف نے حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ حکومت ہمارے جذبات سے کھیلنے اور ہمارا امتحان لینے کی کوشش نہ کرے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام سے مفہوم کیا ہے۔ ہندوستان میں ملک کے عام قوانین غیر اسلامی ہیں لیکن ان کے خلاف حضرات علماء کرام ایک لفظ تک زبان پر نہیں لائے۔ انہوں نے وہاں تحریک پاکستان کی مخالفت سے) کوشش کر کے سیکولر حکومت قائم کرائی تھی۔ لیکن اگر وہ حکومت پرسنل لاز میں مداخلت کی جرأت کرے تو یہ حضرات اس کے خلاف جانیں تک لڑا دیں گے۔ یہی صورت یہاں بھی ہے۔ ملک کے بے شمار قوانین ایسے ہیں جو صریحاً اسلام کے خلاف ہیں۔ انہیں تبدیل کرانے کے لئے ان حضرات کی دینی غیرت کبھی جوش میں نہیں آتی۔ لیکن عائلی قوانین کے خلاف یہ طوفان برپا کر دیتے ہیں (حالانکہ وہ قوانین، سابقہ قوانین کی نسبت، قرآن کریم کے زیادہ قریب ہیں)۔ ان حضرات کا اسلام محدود ہی عبادات اور پرسنل لاز تک ہے۔ اور یہی وہ اسلام ہے جو فرقہ بندی کی قامت پر موزوں بیٹھتا ہے۔

بابُ المراسلات

طاہرہ بیٹیاں متوجہ ہوں

لائل پور سے ایک بچی کا حسب ذیل خط موصول ہوا ہے۔

بابا پرویز۔ اسلام علیکم۔ ابا کے پاس آپ کا رسالہ ہر مہینے آتا ہے لیکن جب میں رسالہ دیکھتی ہوں تو اس میں بچوں کا صفحہ نہیں ہوتا۔ اور سب کا صفحہ ہوتا ہے۔ اس رسالے میں ہمارے لائق کوئی بات نہیں ہوتی۔ اور مجھے قرآنی کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ میں ساتویں جماعت کی طالبہ ہوں اس لئے مہربانی کر کے آسان اردو میں ہمارے لئے بھی قرآن کی باتیں لکھا کریں۔ فقط

آپ کی ننھی طاہرہ بیٹی ......

ہماری اس ننھی طاہرہ بیٹی کے مخلصانہ شوق اور معصومانہ مطالبہ میں اس قدر پرکشش اپیل ہے کہ اسے نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ویسے بھی طلوع اسلام میں "بچوں کے صفحہ" کی ضرورت بالکل واضح ہے۔ لیکن جس قدر یہ ضرورت اہم ہے اسی قدر یہ کام بھی مشکل ہے ـــ اسے "سہل ممتنع" کہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ کام ہماری طاہرہ بیٹیاں نسبتاً آسانی سے سر انجام دے سکتی ہیں۔ اس لئے

میں اپنی طاہرہ بیٹیوں سے اپیل کروں گا

کہ وہ اس باب میں ادارہ کا ہاتھ بٹائیں۔ اس کے لئے ہر ماہ دو چار صفحوں کا مختصر سا مضمون درکار ہو گا۔ جو بیٹیاں اس کے لئے آمادہ ہوں وہ مجھے اطلاع دیں۔ لیکن اتنا سمجھ لیں کہ جو وعدہ وہ کریں گی اسے آخر تک نباہنا ہو گا۔ ان کے جواب آنے پر اس سلسلہ میں باقاعدہ پروگرام مرتب کر لیا جائے گا۔ اس ضمن میں بچوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی رکھنے والے احباب کے مشوروں کو بھی شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔

پرویز

نقد و نظر

المنبر کا غلاف کعبہ نمبر

غلاف کعبہ کی نمائش کی اوٹ میں جماعت اسلامی نے جو جو حرکات کیں اور جس طرح اس کھلے ہوئے شرک کو عین اسلام بنا کر دکھایا گیا مقام اطمینان ہے کہ ملک کے سنجیدہ طبقہ نے اس سے اعلان برأت اور اظہار بیزاری کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہفتہ وار جریدہ المنبر (لائلپور) نے اپنا ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے۔ اس اشاعت خصوصی میں غلاف کعبہ کی شرعی حیثیت اور شعائر اللہ سے متعلق کئی ایک مقالات ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں خود ادارہ کی طرف سے دو مضامین ایسے شامل کئے گئے ہیں جو اپنی افادی حیثیت سے بڑے برمحل اور مفید ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "پاکستان میں غلاف کعبہ پر کیا گزری؟" غلاف کی نمائش کے سلسلے میں جماعت اسلامی سے متعلق اخبارات و رسائل میں عجیب و غریب قسم کی رودادیں شائع ہوتی رہی تھیں۔ اس مضمون میں ان سب کو یک جا مرتب کر دیا گیا ہے جس سے اس کا سارا مرقع بیک وقت سامنے آ جاتا ہے اور انسان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اس سلسلے میں کن کن خرافات کا مظاہرہ ہوا اور انہیں کس طرح ایمان و عقیدت کے مظاہرے قرار دیا گیا۔ دوسرا مضمون ہے۔ "کیا غلافِ کعبہ کی نمائش کا اہتمام مجبوراً کیا گیا تھا" ہوا یہ کہ جب غلاف کی نمائش کے بعد چاروں طرف سے تنقید و تعریض کی بوچھاڑ ہونے لگی تو مودودی صاحب نے ایک مدافعت نامہ شائع کیا جس میں کہا کہ اس سلسلے میں جو کچھ ہوا وہ مجبوراً کرنا پڑا تھا۔ اس میں نہ ان کے قصد و ارادہ کو دخل تھا نہ رضامندی اور طیب خاطر کو۔ المنبر نے خود مودودی صاحب کے دیگر بیانات اور اسلامی جماعت کے اخبارات و رسائل میں شائع شدہ احوال و کوائف سے مودودی صاحب کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ اور ایسے واقعات سامنے لائے گئے ہیں جن سے یہ حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے کہ

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اسی سلسلہ میں المنبر نے ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے مودودی صاحب کا کیریکٹر اُبھر کر سامنے آجاتا ہے لکھا ہے:

ایک امانت کی سپردگی

"غلاف کعبہ کی تشہیر کے سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے جو عذر پیش فرمایا اور جس مجبوری کو اصل وجہ تشہیر و نمائش قرار دیا ہے، وہ حضرات جو مولانا سے تعصب کی حد تک اخلاص و محبت رکھتے ہیں انہیں بھی یہ کہنے سنا کہ یہ مجبوری والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر یہ سارا کام ایمانی تقاضا تھا (جیسا کہ مولانا نے مذکورہ پمفلٹ "تاریخ غلاف کعبہ" میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے) تو اس معذرت کی ضرورت نہ تھی بلکہ اسے پیش کرنا ہی غلط تھا اور اگر مولانا پر ان کے توقف کی علمی غلطی واضح ہو چکی تھی تو اس خلاف واقعہ معذرت کو پیش کر کے انہوں نے اپنی شہرت کے منافی اقدام کیا۔

یہ نمائش تو انتہائی خوش ذہن لوگوں کا ہے ..... لیکن موقع و محل کی مناسبت سے ہم ایک ایسی امانت کو مولانا کی خدمت میں پیش کر کے سرخرو ہونا چاہتے ہیں جو کئی برس سے واجب الادا تھی۔

اجمال اس تفصیل کی یہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۰ء میں مرکزی شوریٰ کے ایک اجلاس کے دوران مولانا مودودی صاحب سے انتہائی عقیدت و محبت رکھنے والے ایک عظیم تر رکن مجلس شوریٰ (عظیم تر اس لئے کہ وہ مولانا کے نزدیک بھی بے حد قابل اعتماد تھے اور جماعتی مناصب و معاملات میں بھی انہیں آخری درجے کے مواقع سالہا سال تک میسر رہے ہیں) انہوں نے سخت اضطراب کی حالت میں یہ بیان کیا کہ امیر جماعت سے میری عقیدت کا شیشہ اس وقت چکنا چور ہوا جب مولانا نے ترجمان القرآن میں ایک سوال کے جواب میں یہ تحریر فرمایا کہ

"میں خود نہ سپاسناموں کو پسند کرتا ہوں نہ پھولوں کے ہاروں اور ان کی بارش کو۔ یہ سب کچھ میری مرضی کے بغیر بلکہ اس کے خلاف ہی ہوتا رہا ہے اور مجھے مجبوراً اس لئے گوارا کرنا پڑا ہے کہ ایک طرف سے اخلاص و محبت کا اظہار اگر کسی نامناسب صورت میں ہو تو دوسرا فریق بسا اوقات سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اگر میں کسی جگہ جا کر اتروں اور وہاں بہت سے لوگ ہار لے کر آگئے ہوں تو کیا یہ کوئی اچھا اخلاق ہوگا کہ میں ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دوں اور ان سے کہوں کہ لے جاؤ اپنے ہاروں کو۔ میں انہیں قبول نہیں کرتا۔ یا میں کسی دعوت میں بلایا جاؤں اور عین وقت پر مجھے معلوم ہو کہ داعیوں نے ایک سپاسنامہ نہ صرف تیار کر رکھا ہے بلکہ طبع بھی کرا لیا ہے اور میں کہوں کہ رکھو اپنا سپاسنامہ"۔

ان محترم رکن مجلس شوریٰ نے بھرے نامشے فرمایا کہ مولانا کی یہ بات صراحتاً خلاف واقعہ ہے اور تو اور ہمارے اپنے ہاں کا واقعہ کہ ہم نے ..... کے متوسط ..... سپاسنامہ مرکز میں بھجوایا اور یہاں سے ترمیمات کے ساتھ واپس

گیا۔ مولانا جب وہاں پہنچے ہاں تشریف لائے تو یہی سپاسنامہ ان کی خدمت میں مع تھیلی کے پیش کیا گیا، مولانا کا یہ جواب کیا امتزاج طور پر ..... کی تعریف میں نہیں آتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا اقامت دین ہم سے ہو سکے گی جو مولانا کے زیر قیادت اس کا علم اٹھائے پھرتے ہیں .....

اور ٹھیک یہی تاثر ان حضرات کا تھا جنہوں نے ایک طرف تو ترجمان میں مذکورہ جواب مولانا کا پڑھا اور دوسری جانب وہ یہ دیکھتے تھے کہ کسی شہر میں مولانا کی آمد سے ہفتوں پہلے جماعت کے آرگن تسنیم میں یہ شائع ہوتا کہ مولانا کی آمد پر سپاسنامہ اور تھیلی پیش کی جائے گی۔ علاوہ بریں سپاسناموں اور تھیلیوں کا اہتمام شاذ و نادر ہی کہیں یہ صورت پیدا ہوئی ہو گی کہ فی الواقعہ مولانا پسند نہ کریں یا انہیں اس کا علم نہ ہو اور سپاسنامہ اچانک پیش ہو جائے۔ ظاہر ہے جب اس صورت واقعہ کا مشاہدہ لوگ اپنی آنکھوں سے کرتے ہوں اور پھر اپنی آنکھوں سے وہ مولانا کا یہ جواب پڑھیں تو ان کا ردعمل وہی ہو سکتا ہے جو اس رکن رکین جماعت پر وارد ہوا۔ اور وہ آج تک اس صدمے سے عہدہ برآ نہ ہو سکے ''

قارئین کو یاد ہو گا کہ اسی المنبر نے اس سے پہلے اس بات کا بھی انکشاف کیا تھا کہ مودودی صاحب نے ملتان جیل میں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے کہا تھا کہ کراچی کی جماعت کے قیم چوہدری غلام محمد صاحب سے جا کر کہیں کہ وہ طلوع اسلام کے دفتر میں کسی کی معرفت ''تالیف قلب'' کر کے طلوع اسلام کے تیے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مودودی صاحب نے آج تک اس کی تردید نہیں کی۔ اب المنبر ان کے کیریکٹر کا ایک اور رخ سامنے لایا ہے جسے دیکھ کر اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ خدا اس امت کی حالت پر رحم کرے جسے اس قسم کے راہ نما ملیں۔

المنبر کی یہ اشاعت ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت ۳۷ پیسے (چھ آنے) ہے اس کی طباعت بہتر ہوتی تو زیادہ اچھا تھا۔

۲۔ تاریخ دعوت و عزیمت

اس کتاب کو ہم نے لپک کر اٹھایا اور بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ اس لئے کہ اس کا عنوان ایسا تھا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ اس میں کسی عظیم انقلاب کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ مصنف تھے سید ابوالحسن علی ندوی جنہوں نے سیرت حضرت سید احمد شہید لکھ کر یہ بتا دیا تھا کہ ان کے نزدیک ''دعوت و عزیمت'' کا مفہوم کیا ہے۔ اور سر ورق پر لکھا تھا کہ اس میں خواجہ معین الدین چشتی۔ خواجہ نظام الدین اولیاء اور مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (رحمتہ اللہ علیہم) کے سوانح حیات اور ان کے تجدیدی و اصلاحی کارناموں کا تذکرہ ہے۔

ہم ہمیشہ یہ معلوم کرنے کے متمنی رہے ہیں کہ حضرات صوفیائے کرام جن کی ہماری تاریخ میں اس قدر شہرت ہے کہ

کسی اور کا نام ان کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ انہوں نے کون سے کارنامے سرانجام دئے تھے۔ ہم خوش تھے کہ اس کتاب میں وہ گوہرِ مقصود مل جائے گا جس کی ہمیں اتنے عرصے سے تلاش تھی۔ لیکن کتاب کو پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ اس لئے کہ اس میں بھی ان حضرات کی انہی ریاضتوں۔ مراقبوں۔ چلہ کشیوں اور کرامتوں کا ذکر ہے جو ان کے دیگر تذکروں میں پائی جاتی ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس میں ذرا احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اور مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ لیکن اس میں بھی جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ان حضرات نے اسلام کو اس قدر پھیلایا' اس کے لئے کوئی مستند تاریخی شہادت پیش نہیں کی گئی۔

سوال یہ ہے ــــــ اور یہ سوال تاریخ کے ہر طالب علم کے سامنے آتا ہے کہ قرآن کریم میں (جس میں دین مکمل ہوگیا) تصوف کا کوئی ذکر نہیں۔ عہدِ نبی اکرمؐ و صحابہ کبارؓ میں (جس میں دین عملی شکل میں دنیا کے سامنے آیا) صوفی کا لفظ تک نہیں ملتا۔ ان کے پروگرام میں ــ جو یکسر دعوت وعزیمت اور انقلاب کا پروگرام ہے ــــ چلّوں۔ ریاضتوں۔ مراقبوں۔ کرامتوں کا نام ونشان تک نہیں پایا جاتا۔ تو پھر تصوف اسلام میں آ کہاں سے گیا۔ اور نہ صرف آ ہی گیا بلکہ اس پر اس طرح چھا گیا کہ اس کے سامنے کسی اور کا چراغ ہی نہ جل سکا۔ اسے "مغزِ دین" قرار دیا گیا۔ اور اس کے حاملین اس طرح مرجع خلائق بن گئے کہ جیتے جی تو ایک طرف' مرنے کے بعد ان کی قبروں تک کی پرستش ہونے لگی۔ چنانچہ اب ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے شاید ایک فی صد بھی ایسے نہ ہوں جنہیں یہ معلوم ہو کہ (مثلاً) حضرت خالد سیف اللہؓ کی قبر کہاں ہے اور ان کی وفات کا دن کون سا۔ لیکن حضرت ... شاہ صاحب نے جس جس مقام پر قدم رکھا تھا وہ لاکھوں مسلمانوں کی سجدہ گاہ بن جاتا ہے۔ اور ان کے عرس شریف کے دن کا انتظار مہینوں پہلے سے ہونے لگتا ہے۔ عوام یہ سب کچھ اندھی عقیدت کی بنا پر کرتے ہیں ــــ اور قوموں کے انحطاط کے زمانے میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ لیکن خواص میں سے بھی کہیں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو کھڑا ہو کر سوچے کہ دین میں اس قدر تغیر کیسے آیا؟ اور یہ حضرات جو امت کی تمام عقیدت مندیوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں اسلام کے لئے انہوں نے کیا کیا تھا۔ وہ سوچے اور اس کے بعد پوری پوری تحقیق کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچے۔ یوں ہی بھیڑ چال اختیار نہ کرے کہ چونکہ فلاں بزرگ کے عقیدت مندوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ رہی ہے اور صدیوں سے ان کی پرستش ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے وہ یقیناً کوئی بہت بڑی ہستی ہوں گے۔ زیرِ نظر کتاب' مجلس تحقیقات ونشریات اسلام' ندوۃ العلماء' لکھنؤ۔ کی طرف سے شائع ہوئی ہے لیکن اس میں بھی تقلید ہی تقلید ہے۔ تحقیق کا نام تک نہیں۔ تقلیدیوں کہ فلاں تذکرہ میں یوں لکھا ہے اور فلاں کتاب میں یوں آیا ہے۔ جس انداز فکر میں ہر جانے والا آنے والے کے لئے سند بن جائے' اسے تحقیق کس طرح کہا جائے گا؟ اے کاش! اس قوم میں کوئی تحقیق کرنے والا پیدا ہو۔ لیکن ایسا وہی کر سکے گا جو اپنی صلیب ــــ آپ اٹھا کر چلے۔

محمد علی اکیڈیمی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کو برِصغیر ہند و پاک کی تحریکِ آزادی کے کفن بردوش مجاہد۔ ملتِ اسلامیہ کے بے باک زعیم۔ آتش نوا خطیب اور شعلہ رقم صحافی کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس لحاظ سے مولانا مرحوم کے کارنامے ہماری تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہیں اور انہیں محفوظ رکھنا ہماری قومی ذمہ داری۔ چنانچہ چند دن ہوئے اس سلسلے میں ہمیں محترم رئیس احمد جعفری کی طرف سے محمد علی اکیڈمی کے قیام کی اطلاع اور اس کے اغراض و مقاصد کا مختصر سا خاکہ موصول ہوا۔ یہ اکیڈمی مولانا مرحوم کی سیرت و کردار، سیاست، صحافت اور اس سے متعلقہ کارناموں کو بڑے مستند جامع اور محققانہ انداز سے شائع کرنے کا عزم رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ ان زعمائے کرام سے متعلق بھی ضروری لٹریچر شائع کرے گی جنہوں نے اس برِصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مختلف محاذوں پر کارہائے نمایاں سرانجام دئے۔

محترم جعفری صاحب کی یہ کوشش ہمارے نزدیک مستحقِ تحسین و تبریک ہے اور ہر مخلص پاکستانی بجا طور پر اسے خوش آمدید کہے گا۔ یہ اشد ضروری ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں اپنے ان محسنوں سے پوری طرح متعارف ہوں جن کی دعوتِ انقلاب، سخت کوششوں اور سرفروشیوں کے باعث انہیں آزادی کی فضاؤں میں پھولنے پھلنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ ہماری دعا ہے کہ محمد علی اکیڈمی جن بلند مقاصد کی بجا آوری کے لئے متشکل ہوئی ہے وہ شایانِ شان طور پر تکمیل کو پہنچیں۔

ان مقاصد کی تکمیل کیلئے اکیڈمی نے یہ پیشکش کی ہے کہ جو اصحاب اس سلسلے میں ہزار روپے یکمشت مرحمت فرمائیں گے، وہ سرپرست اعلیٰ قرار پائیں گے اور انہیں اکیڈمی کی شائع کردہ ہر کتاب زندگی بھر مفت نذر کی جاتی رہے گی۔ اس طرح یکمشت پانچ سو روپے۔ دو صد روپے اور یک صد روپے مرحمت کرنے والوں کو بھی ہدیۂ سپاس کے طور پر کتابوں کی پیشکش میں شامل قرار دیا جائے گا۔

اکیڈمی کا دفتر

۸۹ - نیگور پارک میں قائم ہوا ہے۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی
علمی اور تاریخی کاوشوں کا شاہکار

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد عثمانی نے اردو زبان میں منتقل کیا۔

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا
تفصیلی جائزہ جب آفتاب اسلام کی جلوہ باریوں سے
بزم انسانی کو منور کیا۔

ضخامت ۹۰۰ صفحات ——— قیمت آٹھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۲ / بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

جب تک مرض کی صحیح تشخیص نہ ہو اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ایک نامور
حکیم دیدہ ور نے مدت العمر کی تحقیق کے بعد معلوم کیا کہ

اسباب زوال امت

کیا ہیں۔ اس کتاب نے لوگوں کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر دیا اس کے متعدد ایڈیشن پہلے
شائع ہوئے اب جدید ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد ستے ایڈیشن کے طور پر شائع ہو گیا ہے۔
اس کے ہزاروں کی تعداد میں آرڈر پہلے سے بک ہو چکے ہیں آپ بھی اپنی فرمائش بھیج دیں تاکہ مزید انتظار نہ کرنا پڑے
قیمت: ایک روپیہ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ (۲ / بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور)

رابطۂ باہمی

نئی بزم کا قیام

ڈسکہ (ضلع سیالکوٹ) سے نئی بزم کے قیام کی رپورٹ موصول ہوئی ہے۔ ملک ضیاء اللہ صاحب بزم مذکور کے ناظم مقرر ہوئے ہیں۔

اعلان توثیق ادارہ بزم کے قیام کی توثیق کرتا ہے۔

ادارہ کا نیا فون نمبر

پچھلے پرچے میں ادارہ کے فون نمبر میں تبدیلی کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن جلد ہی یہ نمبر بھی تبدیل ہوگیا۔

اب یہ نیا نمبر

80800

ہے۔ اسے نوٹ کر لیجئے اور اچھی طرح یاد رکھئے

لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن

ہر اتوار کی صبح کو ۸½ بجے ۲۵۔ بی گلبرگ میں پوری باقاعدگی اور اہتمام سے ہوتا ہے۔

پاکستان کا مسئلہ

(طلوع اسلام کنونشن میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا خطاب)

تقسیم ہند سے پہلے کانگریس اور پنڈت نہرو کا یہ دعویٰ تھا کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ قوم نہیں ہیں۔ وہ سوال کرتے تھے کہ وہ کون سی چیز ہے جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ قوم بناتی ہے کیا وہ لوٹا اور بدھنا ہے؟ دوسری طرف مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ ان کا ایک منفرد نظریۂ حیات ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے وہ ایک نظام مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ اس اسلامی نظامِ مملکت کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ حال ہی میں پنڈت نہرو نے اپنے پرانے موقف کو پھر سے دہرایا ہے اور کہا ہے کہ "ہندوستان اور پاکستان میں جھگڑے کی بنیاد کشمیر نہیں بلکہ دو قومی نظریہ ہے اور وہ دو قومی نظریہ کو قبول نہیں کرتے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بھارت نے مذہبی بنیاد پر تقسیم کے اصول کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اور یہ کہ آزادیٔ ہند کے وقت لیگ حکومت کا یہ خیال تھا کہ برصغیر کی تقسیم کی بنیاد یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں لیکن نتائج نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا۔"

(نوائے وقت ۶ر فروری ۱۹۶۳ء)

پنڈت نہرو نے پاکستان کو یہ بہت بڑا چیلنج دیا ہے اور اپنے نقطۂ خیال سے وہ اس میں حق بجانب ہیں کیونکہ آج دنیا کے ہر گوشے میں قومیت کا تصور وہی ہے جو پنڈت نہرو کا ہے۔ آج ہر جگہ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے بلکہ ایک زبان بولنے والے ہم قوم سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مسلم ممالک میں بھی عرب نیشنلزم کا نعرہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ آج عرب ایک الگ قوم ہیں۔ ایرانی الگ۔ افغانی الگ۔ اور پاکستانی الگ یعنی نہ تو ان مختلف ملکوں میں بسنے والے مسلمان مل کر ایک قوم ہیں اور نہ ہی کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمان اس ملک کے غیر مسلموں سے الگ ایک قوم۔ خود پاکستان میں نیشنل عوامی پارٹی عوامی لیگ ری پبلکن پارٹی وغیرہ کا نظریۂ قومیت وہی ہے جو پنڈت نہرو کا ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان جو جداگانہ تصورِ قومیت کی بنا پر حاصل (دو قومی نظریہ) کیا گیا تھا۔ مخلوط انتخاب کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ اب یہاں بھی دو قومی نظریہ کو زیرِ زمین دفن کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف دو قومی نظریہ کے مخالف عناصر کا دعویٰ یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان اقتصادی اور دفاعی نقطۂ نظر سے ایک مضبوط ملک ہوتا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کا موقف غلط تھا اور مولانا ابو الکلام آزاد اور دیگر نیشنلسٹ علماء حق پر تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

آئیے ہم اس امر کا جائزہ لیں کہ (۱) کیا پنڈت نہرو اور ان کے ہم خیال لوگ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نتائج نے

دو قومی نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے؟ (۲) اور کیا پاکستانیوں نے پنڈت نہرو اور دیگر اقوام عالم پر عملی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ دو قومی نظریہ درست ہے اور ہم اس بنا پر تقسیم ملک میں حق بجانب تھے؟ (۳) اور اگر اس کا عملی ثبوت ابھی تک نہیں دیا گیا تو کیا کوئی ایسا راستہ ہے جس سے ہم اپنے دعوے کو سچ ثابت کر سکیں؟ (۴) اور کیا زمانے کے تقاضے ہمیں اجازت دیں گے کہ ہم ایک لمبی مدت تک اپنے دعوے کا عملی ثبوت پیش نہ کریں اور اس اہم ذمہ داری کو پس پشت ڈالتے جائیں؟

تقسیم ملک سے پہلے ہمارا دعویٰ تھا (پاکستان کا مطلب کیا — لا الٰہ الا اللہ) یعنی پاکستان ایک ایسا ملک ہوگا جس میں حکومت اور اقتدار اللہ کا ہوگا اور یہی تقسیم ہند کی بنیاد تھی۔ چنانچہ آج ہمارے دعوے کے سچے یا جھوٹے ہونے کا مدار اس پر ہے کہ پاکستان میں اللہ کی حکومت اور اقتدار کس حد تک رائج ہے؟ اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ اہم اور بنیادی حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ سوال یہاں اللہ کی حکومت کے نعرے کا نہیں بلکہ اس حکومت کے تصور اور عملی وجود کا ہے۔ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیئے کہ جہاں تک اللہ کی حکومت کے نعرے کا تعلق ہے وہ پہلے دن سے ہی فضا میں برابر ارتعاش پیدا کئے ہوئے ہے۔ لیکن یاد رکھیئے کہ قوموں کے بنیادی مسائل محض مقدس نعروں سے حل نہیں ہو جاتے بلکہ اس کے لئے یہ دیکھنا اشد ضروری ہے کہ جس مقصد کے لئے نعرے بلند کئے جا رہے ہیں آیا اس کا واضح اور متعین تصور بھی افراد مملکت کے ذہنوں میں موجود ہے؟ ہماری سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اللہ کی حکومت کا نعرہ تو زور شور سے بلند کیا جا رہا ہے

پاکستان کا مطلب کیا؟

لیکن اللہ کی حکومت کا کوئی واضح تصور خود نعرہ بلند کرنے والوں کے ذہن میں موجود نہیں اور جب تک یہ نہیں ہوگا لا الٰہ الا اللہ کی عملی تعبیر نظام مملکت میں کارفرما نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ دیکھنا ہوگا کہ اللہ کی حکومت کا تصور خود اللہ نے کیا دیا ہے جب تک یہ دو اور دو چار کی طرح صاف نہ ہو اور علیٰ وجہ البصیرت اس پر عمل نہ ہو اس وقت تک پنڈت نہرو کے چیلنج کا جواب ہمارے ذمہ رہے گا۔ وہ مملکت جس میں اقتدار اعلیٰ اللہ کا ہو اس کی چند خصوصیات ہوتی ہیں۔

حکومت خداوندی کی خصوصیات

پہلی خصوصیت

اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر شخص بہ حیثیت انسان ہونے کے واجب التکریم ہوتا ہے (القرآن [illegible]) اس میں کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہوتا کہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ چاہے وہ کتنی بڑی قوتِ نافذہ کا مالک کیوں نہ ہو۔ ([illegible]) حکومت کا حق صرف اللہ کو ہوتا ہے ([illegible]) اور اللہ کی حکومت میں کسی اور کو شریک کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ([illegible]) اللہ کی حکومت کا مطلب اللہ نے خود واضح کر دیا۔ جب کہا کہ اللہ کی محکومیت سے مراد اللہ کی کتاب کی محکومیت ہے ([illegible]) اور اس بات پر زور دیا کہ اس کتاب کے علاوہ کسی اور شے کی محکومیت نہ اختیار کرو ([illegible]) اور یہ بھی واضح کر دیا کہ کتاب کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہوگی۔ یہ نہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس پر عمل کرتا جائے بلکہ یہ کہ کتاب اللہ پر عمل اجتماعی شکل میں ہوگا۔ کتاب اللہ کے قوانین کو نافذ کرنے والی ایک مرکزی اتھارٹی ہوگی۔ اللہ کی اس

حکومت میں سب سے پہلی مرکزی اتھارٹی خود اللہ کے رسولؐ تھے۔ (ﷺ) جنہوں نے بنی نوع انسان کے سامنے ایک نمونہ پیش کیا اور اسے ایک مثالی نظام کی حیثیت دی۔ جس کے اندر رہ کر اللہ کی حکومت قائم کی جاسکتی ہے۔ عملی طور پر بتایا کہ اللہ کے قانون، مرکزی اتھارٹی اور اطاعت کرنے والے مومنین، ان تینوں عناصر میں باہمی ربط کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی فرد سے لغزش ہو جائے تو مسجد کے گوشے میں بیٹھ کر استغفر اللہ کہنے سے معافی نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس فرد کو خود چل کر مرکزی اتھارٹی کے پاس آنا ہوگا اور معذرت پیش کرنی ہوگی۔

نظام کا تصور

اس کے بعد یہ نہیں کہ مرکزی اتھارٹی کو خود اختیار ہے کہ جسے جی چاہے معاف کر دے وہ معافی خود اللہ سے طلب کریگی۔ اور اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کریگی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا اس کے قانون کے مطابق معافی مل سکتی ہے یا نہیں۔ رسول اللہ کا دیا ہوا (PATTERN) ہر آنے والی مملکت کے لئے نمونہ ہے جو اللہ کے نام پہ قائم کی جائے۔ اللہ کی کتاب نے اسلامی مملکت کے لئے غیر متبدل اصول دے دیئے۔ لیکن چند ایک کے سوا تفصیلات نہیں دیں۔ کیونکہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ تفصیلات بدلنے والی شے ہیں۔ اس لئے تاکید کر دی کہ اے مومنو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال مت کیا کرو کہ وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو مشکل میں پڑ جاؤ (۵/۱۰۱) جن قوموں نے تفصیلات کو بھی غیر متبدل بنا دیا۔ وہ ایسی مشکل میں پھنسیں کہ تفاصیل کے ساتھ اصولوں کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ اللہ نے جو باہمی مشاورت کا اصول دیا ہے وہ تفاصیل کو اپنے وقت اور حالات کے مطابق طے کرنے کے لئے دیا ہے بشرطیکہ وہ تفاصیل اصول کی چار دیواری سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ چنانچہ اسلامی مملکت کے لئے ایک ایسا (PATTERN) دے دیا۔ جس میں زمانے کے بدلے ہوئے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں اور افرادِ مملکت ایسے شتر بے مہار بھی نہ ہونے پائیں کہ جو قانون جی میں آئے بناتے چلے جائیں۔ حضورؐ کے زمانے سے پہلے دنیا کا نظام شخصیتوں کے ساتھ بدلتا رہتا تھا۔ ایک بادشاہ یا سپہ سالار کی موت کے ساتھ ساری قوم مفتوح بن جاتی تھی۔ ایک شخصیت کے نہ رہنے سے سارا نظام درہم برہم ہو جاتا تھا۔ لیکن اللہ کی کتاب نے انسانیت کو ایک نئی منزل عطا کی اور کہا کہ اب نظام شخصیتوں کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ مستقل اقدار کے ساتھ وابستہ ہے۔ فرد کی موت کے ساتھ نظام کی موت نہیں ہوتی (۳/۱۴۴) یہی ختم نبوت کا فلسفہ ہے۔

اب دیکھئے کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کہنے والے نعرہ بازوں نے اس ضمن میں کیا کوششیں کیں۔ کیا پاکستان میں ایسا معاشرہ قائم ہو گیا ہے جس میں حکومت اللہ کی کتاب کی ہو اور جہاں انسان دوسرے انسانوں پر حکومت نہ قائم کر سکیں؟ حصولِ پاکستان کے بعد پہلے آٹھ نو برس حکومت کی باگ ڈور ایسے حکمرانوں کے ہاتھ میں رہی جنہیں نہ اتنا شعور تھا اور نہ جرأت

۱۹۵۶ء کا دستور

کہ قوم کے سامنے کوئی اچھا یا برا دستور ہی پیش کر سکیں۔ آخر ۱۹۵۶ء میں ایک دستور تیار ہوا جس کی پیشانی پر قرآن و سنت کے الفاظ تبرکاً لکھ دیئے گئے اور عام شور مچا دیا گیا کہ مملکت مشرف بہ اسلام ہو گئی۔ جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے، "سنت" کا مفہوم متعین نہ تھا اور کتاب جو متعین چیز تھی اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ جہاں تک عملی پہلو کا تعلق ہے کیا دستور بننے کے بعد عوام کی حالت ذرہ برابر بھی بدلی؟ کیا

عوام کی بھوک و ننگ میں کوئی فرق آیا؟ کیا عوام کی اخلاقی حالت کچھ بہتر ہوئی؟ کیا چور بازاری، اقربا پروری اور رشوت ستانی میں ذرہ برابر فرق آیا؟ کیا حاکم و محکوم کے معیارِ زندگی کا تفاوت دور ہوا؟ کیا عوام پر استبداد کی قوتوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی؟ کیا قارونوں کے خزانوں میں کچھ کمی ہوئی؟ اگر نہیں تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ مملکت اسلامی ہو گئی؟ دستور میں لکھا تھا کہ افرادِ مملکت کو یکساں مواقع بہم پہنچائے جائیں گے۔ کیا یہ مواقع بہم پہنچانے کے کوئی ذرائع اختیار کئے گئے؟ کیا آج بنیادی حقوق کا شور مچانے والوں نے عوام کے سب سے بڑے بنیادی حق۔ یعنی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کی طرف کوئی قدم بڑھایا تھا؟ دستور میں لکھ دیا گیا کہ تمام افراد قانون کی نگاہ میں برابر ہیں لیکن کسے معلوم نہیں کہ قانون کے پردے میں استبداد کا کلہاڑا کس طرح چلتا رہا اور خود قانون کے حریم قدس میں قانون کا احترام کس قدر ملحوظ رہا۔ مملکت میں آسامیوں کو پُر کرنے کے لئے بعض علاقوں کے لئے نشستیں مخصوص رکھی گئیں۔ اور صلاحیت کے معیار کو پس پشت ڈالا گیا۔ ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے مذہبی فرقوں کو آزادی دی گئی اور اپنے اپنے (PERSONAL LAWS) کو برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی۔ فواحش کا سدِباب کرنے کی بجائے ان میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ غیر مسلموں کی پوزیشن کو اللہ کی کتاب کے مطابق واضح کرنے کی بجائے مبہم چھوڑ دیا گیا۔ قانون ساز مجلسیں جن کا فریضہ ایک اسلامی مملکت میں اللہ کی کتاب کے مطابق قانون وضع کرنا ہوتا ہے، ان کی رکنیت کے لئے غیر مسلموں کو اجازت دی گئی۔ عدالتیں جن کا فریضہ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے دینا ہوتا ہے ان میں غیر مسلم جج مقرر کئے گئے۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود مملکت اسلامی ہو گئی کیونکہ دستور کے ماتھے پر قرآن وسنت لکھا تھا۔

۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا اور ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ ہو گیا۔ عوام نے اللہ کا شکریہ ادا کیا اور سمجھا کہ

۱۹۶۲ء کا آئین

شاید اب حالت بہتر ہو جائے گی اس طرح وہ نئے آئین کی اُمید میں دن گزارنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد آخر یہ آئین معرضِ وجود میں آیا۔ اس آئین میں سب سے پہلے اسلام کا لفظ اڑا کر مملکت کا نام "جمہوریہ پاکستان" رکھ دیا گیا۔ قانون سازی کے اصولوں میں یہ شق سرِ فہرست رکھ دی گئی کہ کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ یہ بھی ایک منفی چیز ہے۔ یہ کہنے کی بجائے کہ قانون کا ماخذ اللہ کی کتاب ہو گی اور قانون اس کے مطابق بنایا جائے گا، صرف یہ کہا گیا کہ قانون اسلام کے خلاف نہیں ہو گا۔ دراصل جس طرح مملکت کے نام سے اسلام کا لفظ اڑانے میں صاف گوئی برتی گئی، اسی طرح یہاں صاف گوئی سے کام نہیں لیا گیا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اب لفظ اسلام کا کوئی متعین مفہوم لوگوں کے ذہن میں نہیں۔ اس لئے آئین میں اس قسم کی مبہم شرط رکھ دینے سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے کہ یہاں قانون سازی کے مسئلہ پر اس طرح بحثیں شروع ہو جائیں جس طرح سنت کے مفہوم پر ہمارے مذہب پرست طبقہ میں صدیوں سے یہ بحثیں چلی آ رہی ہیں اور آج تک یہ متعین نہ ہو سکا کہ فلاں چیز سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔

اس سے اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام کا نام محض عوام کو خوش رکھنے کے لئے آئین میں داخل کر دیا گیا۔

یاد رکھئے مثبت نتیجہ اور اثر ہمیشہ متعین چیز پیدا کرتی ہے جب تک آئین میں واضح الفاظ میں نہ کہا جائے کہ قانون اللہ کی کتاب کے مطابق ہوگا کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوگا۔

اس کے علاوہ آئین میں (PRINCIPLES OF POLICY MAKING) کی شق میں کہا گیا ہے کہ (۱) پاکستان کے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں اور ان کو سہولتیں مہیا کی جائیں گی تاکہ وہ ان بنیادی اصولوں کو سمجھ سکیں (۲) دوم یہ کہ مسلمانانِ پاکستان کی تعلیم میں قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم لازمی ہوگی۔ (۳) سوم یہ کہ اتحاد اور اسلامی اخلاقی معیاروں کو مسلمانوں کے اندر رائج کیا جائے گا۔ (۴) چہارم یہ کہ زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی صحیح تنظیم کی جائے گی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے (POLICY MAKING) کے اصولوں کی کوئی قانونی پوزیشن نہیں ہوتی۔ یعنی اگر کوئی حکومت اس کے مطابق عمل نہ کرے تو عوام اسے کسی عدالت میں چیلنج نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس قسم کی شقیں نرا وعظ ہوتی ہیں۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا اور سہولتیں مہیا کرنا موجودہ فسق و فجور سے بھرپور نظامِ سرمایہ داری میں جہاں قرآنی نظام کا تصور سرے سے موجود نہ ہو ایک مضحکہ خیز شق ہے۔ قوم میں اسلامی زندگی کی بازآفرینی کے لئے ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے اور یہ اس وقت تک نہیں آسکتا۔ جب تک کہ اس کے محرک خود اپنے سامنے ایک متعین پروگرام نہ رکھتے ہوں۔

قرآنی تعلیم

جہاں تک قرآنی تعلیم کا تعلق ہے ذرا سوچئے کہ جہاں ہدایات یہ ہوں کہ بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھایا جائے اور اس کے بعد صرف لفظی ترجمہ۔ قرآن کا مفہوم بالکل نہ سمجھایا جائے کیونکہ اس سے فرقہ وارانہ مناقشات بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ آپ خیال فرمائیے کہ کیا قرآن کے الفاظ کا ترجمہ پڑھا دینے سے واقعی قرآنی تعلیم حاصل ہو سکتی ہے؟ کیا قرآن ایسی کتاب ہے جس کا مفہوم واضح کرنے سے اختلافات پیدا ہونے کا خطرہ ہے حالانکہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دنیا سے اختلافات مٹانے کے لئے آیا ہے۔

دینیات کی تعلیم جو اسکولوں میں دی جاتی ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ ایک ایسے طالب علم میں جو دینیات کی کلاس میں جاتا ہے اور وہ جو نہیں جاتا کوئی ذہنی فرق نظر نہیں آتا۔ اخلاقی معیاروں کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنے کا طریق کیا ہوگا کسی کو معلوم نہیں اور قوم کے اخلاقی معیار اس آئین کے نفاذ کے بعد کس قدر بلند ہوئے ہیں یا کس قدر پستی کی طرف مائل ہیں یہ بھی روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے۔

ایڈوائزری کونسل

اسی طرح آئین میں اسلامک انسٹی ٹیوشنز کے نام پر ایک ایڈوائزری کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی مقرر کی گئی ہے جس کے مقاصد یہ ہیں کہ (۱) کونسل مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے سامنے یہ سفارشات پیش کرے گی کہ مسلمانانِ پاکستان کس طرح اپنی زندگیوں کو اسلامی بنیادی اصولوں کے مطابق بنائیں۔ کونسل مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں صدر یا گورنروں کو ان کے استفسار پر مشورہ دے گی کہ آیا کوئی قانون، قانون سازی کے اصولوں کے خلاف تو نہیں۔ جہاں تک اس کونسل کا تعلق ہے اول تو ہر قانون کے متعلق اس سے مشورہ لینا ضروری نہیں۔ یہ اسمبلیوں کی مرضی پر

موقوف ہے کہ اس سے مشاورت طلب کریں یا نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ اس کے مشورے کو قبول کرنا یا نہ کرنا اسمبلیوں کے اختیار میں ہوگا۔ جسے چاہیں قبول کریں اور جسے چاہیں مسترد کر دیں۔ تیسرے یہ کہ کونسل کے ارکان خود "اسلام" پر متفق نہیں ایک رکن کہتا ہے کہ عائلی قوانین اسلام کے مطابق ہیں۔ دوسرے کی رائے ہے کہ یہ اسلام کے خلاف ہیں۔

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایک اور چیز اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے اس کے متعلق کسی کو معلوم تک نہیں کہ وہاں کیا ریسرچ ہو رہی ہے ——— کسی میونسپل کمیٹی کی کارکردگی کی خبر تو شاید اخباروں میں آجائے لیکن ملک کے اتنے بڑے ادارے کے متعلق کسی کو آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ برسوں سے قائم ہے۔ کیا آپ نے آج تک اس کی ریسرچ کی کوئی چیز بھی اپنے سامنے دیکھی ہے؟

دوسری خصوصیت

وہ مملکت جس میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ کا ہو اس کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں معاملات کا فیصلہ ما انزل اللہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اللہ کی کتاب میں لکھا ہے کہ جو لوگ معاملات کا فیصلہ ما انزل اللہ کے مطابق نہیں کرتے وہ امتِ مسلمہ کے رکن نہیں بلکہ کافر یعنی مسلمانوں سے الگ ایک قوم ہیں (۵/۴۴)۔ یعنی قرآن نے قومیت کا ایک ایسا واضح اور دوٹوک معیار مقرر کر دیا جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں پاکستان کے دو دستور یکے بعد دیگرے معرضِ وجود میں آئے ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ مملکتِ پاکستان میں معاملات کے فیصلے ما انزل اللہ کے مطابق ہوں گے۔

ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے موجودہ آئین کے مطابق جو ایڈوائزری کونسل معرضِ وجود میں آئی ہے اس کی کارکردگی کا بھی کسی کو علم نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے ارکان اس بات پر بھی متفق ہیں یا نہیں کہ ما انزل اللہ سے مراد کیا ہے۔ میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس کونسل کے ارکان میں چند علماء حضرات بھی شامل ہیں اور علماء کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ ان میں سے ہر فرقہ کا اسلام اپنا اپنا ہوتا ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کے عقائد کے مطابق ما انزل اللہ سے مراد اللہ کی کتاب کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ لیکن کونسل کے ارکان بھی کیا کریں۔ ہماری اسمبلیاں جس نہج پر چل رہی ہیں ان میں شاید قانون کو اسلامی رنگ دینے میں صدیاں گزر جائیں اور کون جانے پاکستان میں اللہ کا قانون عملی طور پر کب نافذ ہوا اور کب ہم دنیا پر ثابت کر سکیں کہ دو نظریہ حقیقتاً درست ہے کیا زمانہ ہمیں اتنی مہلت دے گا؟

تیسری خصوصیت

اللہ کی حکومت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر انسان محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں عزت کا مستحق ہوتا ہے (۷۰/۱۷)۔

معیارِ تکریم

آپ اپنے معاشرے پر نگاہ ڈال کر دیکھئے کہ اس لحاظ سے ہم میں اور ہندوستان کے باشندوں میں جن سے ہم نے علیحدہ خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا کہ ہم اپنی آئیڈیالوجی کی بنا پر ایک الگ قوم ہیں، کوئی فرق ہے؟ کیا ہمارے اندر ذات پات کی تمیز بعینہٖ اسی طرح موجود نہیں جس طرح ہندوؤں کے اندر ہے؟ کیا ہم سید۔ پٹھان۔ مغل۔ راجپوت اور ارائیں وغیرہ کے ڈربوں میں اسی طرح بند نہیں جس طرح ہندوؤں کے ہاں برہمن کھشتری۔ ویش اور شودر ہیں۔ کیا ہمارے معاشرہ میں ایک موچی یا دھوبی کا پڑھا لکھا بچہ اتنا عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جتنا کسی سید یا پٹھان کا جاہل بچہ؟ کیا کوئی مغل اپنی ان پڑھ لڑکی کا رشتہ ایک جولاہے کے تعلیم یافتہ لڑکے سے کرنے کے لئے تیار ہے؟ کسی اسمبلی کی نشست پر جہاں (مثلاً) ایک ارائیں امیدوار کھڑا ہو کسی غیر ارائیں کے لئے ممکن ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے؟ ان حقائق کی موجودگی میں پنڈت نہرو یہ کہیں کہ دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے تو آپ ان کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں۔؟

چوتھی خصوصیت

اللہ کی حکومت کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں مدارج کا معیار کردار کی بلندی اور حسنِ عمل پر ہوتا ہے (۴۹) لیکن اس کے برعکس ہمارے ہاں آج مدارج کا معیار دولت (خواہ وہ کسی طریق سے حاصل کی گئی ہو) اور سیاسی مہرہ بازیوں پر بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح دنیا کی دوسری قوموں میں۔ معاف فرمائیے! آج ہمارے ہاں

حسنِ کردار

کتنے سربراہ ایسے ہیں جو کردار کی بلندی اور حسنِ عمل میں ملک کے دوسرے لوگوں سے بلند ہیں۔ پاکستان کے کسی ایک حلقۂ نیابت کو لے لیجئے۔ اس حلقے کا منتخب شدہ ممبر وہاں کے دوسرے لوگوں کی نسبت یا زیادہ دولت مند ہوگا یا زیادہ سیاست کار۔ یا اس کی برادری بڑی ہوگی یا حلقہ زمینداری بڑا ہوگا۔ وہ اسی بنا پر انتخاب میں کامیاب ہوا ہوگا نہ کہ اس وجہ سے کہ اس کا کیریکٹر فریقِ مخالف کے مقابلہ میں زیادہ بلند تھا۔ معاشرہ میں ہر دولت مند عزت کا مقام حاصل کر لیتا ہے چاہے وہ دھوکا باز۔ مکار۔ رشوت خور اور اسمگلر ہی کیوں نہ ہو۔ یہی محلے کا چوہدری ہوگا۔ لوگ اس کی تعظیم کریں گے۔ اور جب ووٹنگ کا وقت آئے گا تو اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ آپ قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق مدارج کا معیار کردار کی بلندی اور حسنِ عمل مقرر کر کے دیکھئے۔ آپ دُنیا کی ہر قوم سے ممیز اور افضل نظر آئیں گے اور دنیا پکار پکار کر کہے گی کہ پاکستانی حقیقتاً ایک الگ قوم ہیں اور دو قومی نظریہ واقعی حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ دعوےٰ محض نظریاتی نہیں۔ چشمِ فلک نے وہ نظارہ دیکھا ہے۔ جب مدارج کا معیار صرف کردار کی بلندی اور حسنِ عمل تھا۔ اس نے گٹھڑی کندھوں پر لاد کر کپڑا بیچنے والے کو بھی امیر المومنین بنتے دیکھا ہے۔ عرب کی چراگاہوں میں اونٹ چرانے والے کو امیر المومنین بنتے دیکھا ہے۔ اور ایک چکی پیسنے والی امیر المومنین کی بیوی کو بھی دیکھا ہے۔ یہ لوگ قوانینِ خداوندی کی اطاعت، کردار کی بلندی اور حسنِ عمل سے امیر المومنین بنے تھے اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ اپنی امتیازی خصوصیت کے اعتبار سے دُنیا بھر سے ایک الگ قوم تھے۔

پانچویں خصوصیت

وہ مملکت جس میں اقتدار اعلیٰ اللہ کا ہو اس کی پانچویں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (روٹی۔ کپڑا۔ مکان۔ علاج۔ تعلیم وغیرہ) کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ (۱۱/۶ - ۲۰/۱۱۸)۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی اللہ کی حکومت میں مملکت اور افراد کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی رُو سے مملکت، افراد معاشرہ سے ایک جنتی معاشرہ کے بدلے ان کے جان و مال خریدتی ہے۔ مملکت کو جس وقت ضرورت ہو اور جس قدر ضرورت ہو افراد کو اپنے جان و مال حاضر کرنے پڑتے ہیں اور اس کے عوض مملکت ایک ایسا معاشرہ مہیا کرتی ہے جس میں نہ صرف یہ کہ کوئی بھوکا ننگا نہیں رہتا بلکہ ہر فرد معاشرہ کو اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے وہ اس دنیا میں ہی عزت کا مقام حاصل نہیں کرتا — بلکہ آخرت کی زندگی میں بھی سرخرو اور کامیاب ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت کے سوا کوئی دوسری مملکت اس ذمہ داری کو نہیں سنبھالتی۔ ایک لادینی ریاست زیادہ سے زیادہ ایک (WELFARE STATE) ہو سکتی ہے۔ اللہ کی حکومت میں ایک طرف خدا کے نام پر اطاعت لی جاتی ہے تو دوسری طرف وہ ذمہ داریاں پوری کرنی پڑتی ہیں جو اللہ نے اپنے ذمہ لی ہیں۔ یہ خرید و فروخت کا معاملہ اکراہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔ بلکہ باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ درحقیقت ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا انسانی زندگی کا منتہیٰ نہیں بلکہ مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور ضروریاتِ زندگی کا پورا ہونا اس راستے میں ایک قدم ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ نظام پروان چڑھا اور دنیا جانتی ہے کہ انہوں نے کس حسن و خوبی سے ان ذمہ داریوں کو پورا کیا اکین کیا۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔ کہنے والوں نے ان ذمہ داریوں کو معمولی حد تک بھی پورا کر لیا ہے۔ ملک کے اندر آج کتنے لوگ ہیں جن کی ضروریاتِ زندگی بطریقِ احسن پوری ہو رہی ہیں۔ غریبوں کی آہیں اور کراہیں تو ایک طرف، اب تو متوسط طبقہ بھی بھوک سے نڈھال ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مملکت ان کی ذمہ داریوں کو پورا کیوں نہ کرے جب کہ سارے پاکستان کی دولت سمٹ کر صرف دو صد خاندانوں میں جمع ہو گئی ہے۔ صنعت کا فروغ جتنا پاکستان میں ہوا ہے اس سے کئی گنا زیادہ ہندوستان میں ہو چکا ہے۔ دونوں ملکوں میں صنعتی ترقی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ لیکن بھوکوں کی تعداد میں نہ وہاں کمی ہوئی ہے اور نہ یہاں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صنعتی ترقی ایک مستحسن قدم ہے لیکن عوام اس وقت تک خوش حال نہیں ہو سکتے جب تک کہ بنیادی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ جب تک ملک سے قارون ختم نہیں ہوتے جب تک کہ ملک کے وسائل پیداوار مملکت کی تحویل میں نہیں آتے اور جب تک مملکت عوام کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ دار نہیں ہوتی اس وقت تک دو قومی نظریہ کو پیچ کر کے دکھایا نہیں جا سکتا۔

چھٹی خصوصیت

وہ مملکت جہاں اللہ کی حکومت ہو اس کی چھٹی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہاں ہر ایک کے ساتھ عدل ہوتا ہے۔

نظامِ عدل | ہر فرد کو اس کا حق ملتا ہے اور افراد کی نشوونما کے لئے مساوی مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں اور اس کے باوجود اگر کسی فرد میں کمی رہ جائے تو نظامِ معاشرہ اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ عدل اور احسان اسلامی مملکت میں ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں عدل سے مراد صرف عدالتی عدل نہیں بلکہ عدل زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ حضرات انبیائے کرامؑ دنیا میں عدل قائم کرنے کے لئے آتے رہے لیکن مخالف قوتیں ہمیشہ نظامِ عدل کو نظامِ استبداد میں بدلتی رہیں اور اللہ کی کتاب کے مطابق استبداد ہمیشہ تین شکلوں میں نمودار ہوتا رہا۔ سیاسی استبداد۔ مذہبی پیشوائیت کا استبداد اور سرمایہ داری کا استبداد۔ نظامِ عدل کے قیام میں سب سے مشکل کام فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کی دستبرد سے عوام کو نجات دلانا ہوتا ہے کیونکہ جب تک اس سنگِ گراں کو راستے سے نہ ہٹایا جائے استبداد میں جکڑی ہوئی دنیا کے اندر اللہ کی کتاب کے مطابق مملکت کا قیام ممکن نہیں۔ سیاسی استبداد میں حکومت یا تو کسی قانون کی پابند نہیں ہوتی یا ایک حد تک پابند تو ہوتی ہے مگر اختیار رکھتی ہے کہ جب جی چاہے اس پابندی کو ختم کر دے۔ دوسری طرف اللہ کی حکومت میں اللہ کے قانون کا لازماً پابند رہنا پڑتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں اللہ کا قانون نافذ نہ ہو حکومتوں کا شتر بے مہار ہونا لازمی امر ہے اسی طرح ان حاکموں کی حکومتیں بھی مستبد ہوتی ہیں جن کے ہاں مجلسِ مشاورت تو موجود ہو لیکن وہ خود جواب دہی سے آزاد ہوں۔ اس کے برعکس اللہ کی حکومت میں (جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں) حکم اللہ کے قانون کا ہوتا ہے خود حاکم کا نہیں ہوتا۔ اور اللہ کے قانون سے آزاد ہو کر نہ صرف یہ کہ حاکم، حاکم نہیں رہتا بلکہ وہ قومِ مومنین کا فرد بھی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ وہ حکومتیں بھی مستبد ہو سکتی ہیں جو نمائندہ یا غیر نمائندہ جماعتوں کے ہاتھوں میں ہوں۔ کیونکہ مشاورت میں چند لوگوں کی شمولیت استبداد کا سدِباب نہیں کر سکتی۔ خاص کر ایسی صورت میں جب نمائندوں نے اپنی نمائندگی صلاحیت اور حسنِ کردار کی بنا پر نہیں بلکہ استبداد کی بنا پر حاصل کی ہو۔ اس قسم کی حکومتیں شخصی حکومتوں سے بھی زیادہ جابر اور مضر ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اللہ کی حکومت میں نہ حکمران اللہ کے احکام سے باہر نکل سکتے ہیں اور نہ مجلسِ مشاورت۔ اس لئے عوام پر ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ حکومتیں بھی مستبد ہوتی ہیں جو عوام کی نمائندہ تو ہوں لیکن ان میں تنفیذی قوتیں قانونی قوتوں کے آگے ہر وقت جوابدہ نہ ہوں۔ اور جس میں عوام حکمرانوں کا محاسبہ کرنے کا حق نہ رکھتے ہوں۔ اللہ کی حکومت میں تنفیذی قوتیں قانونی قوتوں کے آگے ہر وقت جوابدہ ہوتی ہیں اور عوام حکمرانوں کے محاسبہ کا حق رکھتے ہیں۔ یہاں دراصل حکم اللہ کا ہوتا ہے اور حکمران صرف اسے نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ غرضیکہ کوئی حکومت استبداد سے مبرا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اقتدار قانون کا نہ ہو اور قانون بھی انسانی ذہن کی پیداوار نہ ہو بلکہ اللہ کے غیر متبدل اور اٹل قوانین کے دائرے میں گھرا ہوا ہو۔

اب ان اصولوں کی روشنی میں دیکھئے کہ پاکستان میں گزشتہ ۱۵ برس میں عدل کا پلڑا بھاری رہا یا استبداد کا؟ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں جہاں اللہ کا قانون نافذ نہ ہو وہاں استبداد کا ہونا لازمی ہے۔ مملکتِ پاکستان میں کتنی حکومتیں بدلتی رہیں۔ ہر آنے والی حکومت اپنے کو عادل اور جانے والی حکومت کو ظالم کہتی رہی۔ لیکن قوم ہے کہ استبداد

پاکستان کی حالت کی چکی میں پستی گئی۔ وہی پہلے مستبد آج پھر اکٹھے ہو کر نعرہ لگا رہے ہیں کہ ملک میں جمہوریت بحال ہونی چاہیئے۔ ان کا خیال ہے کہ شاید ان کی جمہوریت کے نظائر عوام کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اس نعرے میں سیاسی مداری اور مذہبی پیشوا سب شریک ہیں۔ آپ دیکھئے کہ ان میں سے کوئی بھی اس بات پر زور نہیں دیتا کہ مملکت میں اللہ کا قانون نافذ ہو۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ استبداد کی جڑ اللہ کے قانون کے نفاذ سے کٹے گی یا جمہوریت کی بحالی سے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شخصی، نیم شخصی یا جمہوری حکومت میں کوئی فرق نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ کا قانون نافذ نہ ہو۔

دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا استبداد ہے۔ سیاسی استبداد کی حکومت جسم پر ہوتی ہے تو پیشوائیت کے استبداد **مذہبی پیشوائیت** کی ذہنوں پر۔ پیشوائیت انسانوں کو خرافات اور اوہام کے آگے سر جھکانا سکھاتی ہے اور دلوں میں موہوم خطرات پیدا کرتی ہے۔ پھر ایسے دروازے دکھاتی ہے جن میں سے گزرنے سے خطرات سے بچاؤ ہو سکے۔ مذہبی پیشوا خود ان دروازوں پر دربان بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور دروازے بھی صرف اسے داخل ہونے دیتے ہیں جو داخلہ کی فیس پیشگی ادا کرے۔ پاکستان کی تعمیر میں ان مذہبی پیشواؤں کا حصہ صرف اتنا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات کو ابھارا ہے۔ کسی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے جایئے۔ خطبہ کا بیشتر حصہ ایک دوسرے پر طعن و تشنیع میں صرف ہوگا۔ جتنا بھاری بھرکم خطیب ہوگا اتنی زیادہ گالیاں سنائے گا۔

اس کے علاوہ سرمایہ داری کا استبداد ہے جو انسانوں کی دولت پر ڈاکہ زن ہوتا ہے یہ زندگی کے ہر شعبے پر مسلط ہے کوئی **سرمایہ داری** فیکٹری ہو یا کھیت۔ منڈی ہو یا دفتر۔ پیر کی گدی ہو یا ضلع کچہری۔ وکیل کا دفتر ہو یا ڈاکٹر کا کلینک ہو۔ ہر جگہ ایک ہی روح کارفرما ہے۔ ایک شخص دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈالتا ہے دوسرا تیسرے کی تلاش میں رہتا ہے اور تیسرا چوتھے کی۔ پاکستان بننے کے بعد قارونیت میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ ملک کی دولت سمٹ کر چند مٹھی بھر انسانوں کے پاس آ گئی ہے۔ پاکستانی معاشرے کا سارا خون سمٹ کر چند اعضاء میں جمع ہو گیا ہے اور باقی اعضاء لاغر اور بے جان ہو گئے ہیں۔ غرضیکہ پاکستانی معاشرہ بیمار ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بیماری پاکستان تک ہی محدود نہیں۔ دوسرے ممالک بھی بیمار ہیں لیکن جو اصل سوال درپیش ہے اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیجئے۔ یعنی اگر پاکستان میں ہم قرآنی عدل قائم نہیں کر سکے اور سلب و نہب کی قوتیں یہاں دوسری اقوام عالم سے بھی زیادہ شدت سے کارفرما ہیں تو پھر وہ خصوصیت کیا ہے جو مسلمان کو ایک علیٰحدہ قوم بناتی ہے اور جس کی بنا پر ایک علیٰحدہ خطہ زمین حاصل کیا تھا؟

ساتویں خصوصیت

وہ مملکت جہاں اللہ کی کتاب کی حکومت ہو اس کی ساتویں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے نوع انسانی کی منفعتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ (۴۵ - ۱۳) جہاں تک فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ ہم غیر قوم کی غلامی سے ابھی ابھی نکلے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس کے مواقع نسبتاً بہت کم ملے ہیں۔ دوسری قوموں کی سائنٹفک ریسرچ

تیز فطرت کی تاریخ ہماری نسبت بہت دیرینہ ہے لیکن میں یہ کہنے میں بڑی مسرت محسوس کرتا ہوں کہ جس قدر مواقع ہمیں میسر ہوتے ہیں ان کی نسبت سے ہمارے سائنس دان دوسروں سے بہت پیچھے نہیں ہیں۔ کم از کم طالب علموں میں سائنس کا شوق بڑھ رہا ہے اور عام رجحان یہ ہے کہ چوٹی کے طالب علم آرٹس کی بجائے سائنس کے مضامین کو ترجیح دیتے ہیں۔ سائنس کے ہر شعبے میں فزکس ہو یا کیمسٹری۔ میڈیسن ہو یا سرجری۔ باٹنی ہو یا زوآلوجی۔ جی آلوجی ہو یا فارسٹری۔ ماضی کے مقابلہ میں ہم بہت آگے ہیں اور سائنس کی معلومات کو سردست یہاں نوع انسانی کی منفعت کے لئے ہی استعمال کیا جا رہا ہے۔ شاید اس لئے کہ ہماری معلومات ابھی اس حد تک نہیں پہنچیں جہاں ان کے استعمال کا تخریبی پہلو سامنے آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں سائنس کی طرف رجحان اور ترقی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس شعبے میں مذہبی پیشوائیت کا قدم نہیں پہنچا۔

آٹھویں خصوصیت

وہ مملکت جس میں اللہ کی کتاب کی حکومت ہو اس میں آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اللہ کے قانون کو حکماً نافذ کیا جاتا ہے۔ اللہ کی کتاب نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ اگر ان کو زمین میں اقتدار ملتا ہے تو وہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے نظام کو قائم کرتے ہیں اور جو چیز الکتاب کے مطابق معروف (LAWFUL) ہے اس کا حکم دیتے ہیں اور جو منکر (UNLAWFUL) ہے اس سے روکتے ہیں (۲۲/۴۱) یعنی جب اقتدار ملتا ہے تو حکومت کا فریضہ ہوتا ہے کہ اللہ کے قانون کو حکماً منوائے یعنی اسے ملک کا رائج الوقت قانون بنائے۔ یہ بھی یاد رکھیئے کہ امر بالمعروف کسی ایک گروہ یا پارٹی کا کام نہیں۔ یہ پوری امت کا فریضہ ہے۔

مشاورت "امرہم شوریٰ بینہم" کے ارشاد خداوندی کے مطابق پوری امت کے نمائندے مشاورت میں شامل ہوں گے۔ امت اس مشاورت کو مرکز کی طرف لوٹائے گی اور مرکزی مشنری اسے اللہ کے قانون کی کسوٹی پر پرکھے گی اور اس کے بعد اسے حکماً نافذ کیا جائے گا۔ اس نظام میں نہ ملوکیت باقی رہتی ہے نہ پیشوائیت۔ حکم صرف اللہ کا ہوتا ہے لیکن اگر کوئی حکمران اللہ کے قانون کی حدود سے باہر نکلتا ہے تو عوام کو حق پہنچتا ہے کہ عدلیہ کی طرف رجوع کریں اور اس کا محاسبہ کریں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص ہر وقت اٹھ کر حکومت کو چیلنج کرتا ہے بلکہ ایسی مشنری وضع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں (CHECKS AND BALANCES) مقرر کئے جائیں تاکہ نہ حکام اللہ کے قانون سے باہر جا سکیں نہ عوام۔

نویں خصوصیت

وہ مملکت جس میں اقتدار اعلیٰ اللہ کا مانا جاتا ہو اس کی نویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مملکت سرکش اور مفسد قوتوں کی روک تھام کا انتظام کرتی ہے تاکہ دنیا میں فساد برپا نہ ہو۔ (۲/۲۰۵) اور افراد مملکت کے اندر ایک عظیم کیریکٹر پیدا کر کے انہیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ ایسی داخلی اور خارجی قوتوں کے خلاف جنگ کر سکیں جن کا مقصد قوانین حق و عدل سے سرکشی ہو اور وہ مناسب تعلیم و تربیت سے افراد کی کمزوریوں کو دور کرتی ہے تاکہ وہ جہاد زندگی میں مردانہ وار شریک ہو سکیں۔ اس مملکت کا ہر

فرد سپاہی ہوتا ہے۔ ان کی خوراک، لباس، بودوباش سپاہیانہ ہوتی ہے ان کا دن میں پانچ مرتبہ وقت کی پابندی سے اجتماع صلوٰۃ میں شامل ہونا اور ایک کمانڈر کی آواز پر اللہ کے آگے جھکنا سپاہیانہ عمل ہوتا ہے۔ ایک سال میں

روح عسکریت

مسلسل ایک ماہ تک روزے رکھ کر تن آسانی کو دور کرنا اور مشقت کا عادی بننا ایک سپاہیانہ عمل ہوتا ہے انہیں اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ کس وقت اور کہاں پر لڑنا ہے۔ آلی کی سخت سردی ہیں یا لیبیا کی آتش فشاں گرمی میں لیکن ان کی زندگی مسلسل قتال کی تیاری میں گزرتی ہے۔ اس لئے کہ قتال ان پر اللہ کی کتاب نے فرض قرار دیا ہے (۲/۲۱۶) ہتھیار ان کے لباس کا جزو ہوتے ہیں جنہیں وہ اجتماع صلوٰۃ میں بھی جسم سے جدا نہیں کرتے۔ (۴/۱۰۲) ان کے نزدیک زندہ وہی رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا (۴/۷۸) وہ استقامت اور صبر سے کبھی دامن کش نہیں ہوتے۔ (۲/۲۵۰) وہ عہد پیمان کا احترام کرتے ہیں قول وقرار کے پکے ہوتے ہیں اور جب مخالف قوتیں آمادہ پیکار ہو جائیں تو ہر خوف سے بالاتر ہو کر ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے ہیں (۸/۴۵)۔ میدان جنگ میں مسلسل خطرے سے ان میں روح عسکریت (BATTLE MINDEDNESS) پیدا ہوتی ہے اور میدان جنگ میں مسلسل بھوک اور پیاس۔ مالوں اور جانوں کا نقصان اور ان تمام قربانیوں کے باوجود فوری ثمرات سے محرومی ایسی کڑی آزمائشوں سے بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی (۲/۱۵۵) ان کی جنگ ذاتی مصلحتوں یا انتقام کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی راہ میں فتنہ پردازی کو روکنے کے لئے ہوتی ہے اور وہ برسر پیکار اس وقت ہوتے ہیں جب دشمن جنگ پر اتر آئے (۲/۱۹۰) لیکن جب وہ جنگ پر مجبور ہو جاتے ہیں تو دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور جن گھروں سے دشمن نے انہیں نکالا تھا ان سے اسے نکال باہر کرتے ہیں کیونکہ ظلم ان کے نزدیک جنگ سے زیادہ تباہ کن ہوتا ہے (۲/۱۹۱)، وہ دشمن کی کثرت تعداد سے ہراساں نہیں ہوتے بلکہ تعداد کی کمی کو سیرت وکردار کی قوت سے پورا کرتے ہیں (۸/۶۵) ان کے کمانڈر علم اور جسم کے اعتبار سے توانا ہوتے ہیں (۲/۲۴۷) وہ جنگ میں لوٹ مار اور دنیاوی مفاد پر نگاہ نہیں رکھتے۔ کیونکہ اس سے اجتماعی نقصان ہوتا ہے۔ وہ کسی بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی جنگ کے اندر اپنا مورچہ نہیں چھوڑتے۔ (۳/۱۵۲) وہ خطرات میں جینے کو زندگی سمجھتے ہیں ان کے نزدیک حیات مرگ باشرف کا نام ہے۔ اور موت حیات بے شرف کو کہتے ہیں۔ زندگی ان کے ہاں مجاہدانہ تگ وتاز سے عبارت ہوتی ہے۔ قانون خداوندی پر یقین انہیں ہر جگہ کامیاب وکامران بناتا ہے (۸/۶۵)، وہ کفار کے مقابلے میں نہایت سخت ہوتے ہیں لیکن آپس میں ابریشم کی طرح نرم ہوتے ہیں۔ (۴۸/۲۹)، جب دنیاوی زندگی کے کسی تعلق اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ دنیاوی مفاد کو قربان کر دیتے ہیں۔ دشمن کا لشکر دیکھ کر ان کا ایمان اور مضبوط ہو جاتا ہے (۳/۱۷۳) ان کے نزدیک جان ومال سے جدوجہد کرنے والوں کے مدارج سہل انگاروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ (۴/۹۵)۔

ہماری بدبختی

یہ ہے وہ قوم جو اسلامی مملکت کے خاکے میں رنگ بھرتی ہے اور جہاد مسلسل سے اسے جنت ارضی کا حسن وجمال عطا کرتی ہے آئیے اب اس بات کا جائزہ لیں کہ ہم پاکستانی اس معیار پر کس حد تک پورے اترتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقسیم ہند کے وقت ہندی مسلمانوں میں صدیوں کی غلامی کے تاثرات موجود تھے۔ گو دور غلامی میں بھی مسلمانوں کے اندر مجاہدانہ تحریکیں اٹھتی رہیں لیکن حاکم قوم کے سیاسی استبداد نے انہیں پنپنے نہ دیا۔ اس وقت مسلمان کا کیرکٹر پست تھا گو قومیت کا جذبہ ابھر چکا تھا لیکن عسکریت اور تنظیم موجود نہ تھی چنانچہ مسلمان گولی کی آواز سے ڈرتا تھا۔ وہ دشمن کی کثرت سے خائف تھا۔ وہ اجتماع صلوٰۃ اور روزہ کو پوجا پاٹ کا معاملہ سمجھتا تھا۔

چنانچہ ہمارے جالندھر شہر میں ۷۰ ہزار مسلمانوں نے جو وہاں کی آبادی کا قریباً ۷۰ فیصدی تھے تین دنوں کے اندر گولی کی آواز سے گھبرا کر شہر خالی کر دیا۔ بڑے بڑے تیس مار خاں لوگوں کو جو دن رات پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کے نعرے لگاتے نہ تھکتے تھے گولی چلنے پر اپنے گھروں میں سہمے ہوئے بیٹھے پایا گیا اور عورتوں کی طرح گریہ وزاری کرتے سنا گیا۔ اگر یہ مسلمان قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح عسکری ہوتے ان کے اندر تنظیم ہوتی وہ ہتھیار کے استعمال سے واقف ہوتے۔ دشمن کے حملے سے بچنے کی صلاحیت رکھتے۔ ان کا موت کے بعد زندگی پر پختہ ایمان ہوتا تو آج پاکستان کا نقشہ اس سے مختلف ہوتا اور مسئلہ کشمیر جیسی الجھنیں موجود نہ ہوتیں لیکن کیا پاکستان بننے کے بعد ہم نے کوئی ایسا عملی قدم اٹھایا جس سے قوم کے اندر اپنے بچاؤ کی صلاحیت پیدا ہوتا تاکہ یہ آنے والے خطرات سے محفوظ رہ سکے یہ درست ہے کہ پاکستان کے پاس ایک قابلِ فخر فوج موجود ہے اور وہ بجا طور پر اس کی صلاحیتوں پر ناز کر سکتا ہے لیکن کیا صرف اس سے ایک اسلامی مملکت کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں جن کی تفصیل میں نے قرآن کی رو سے اوپر بیان کی ہے؟ کیا مملکت کی باضابطہ فوج کو چھوڑ کر باقی قوم اس قابل ہے کہ کسی کڑی آزمائش کے وقت ثابت قدم رہ سکے؟ صرف باضابطہ فوج پر انحصار رکھنا ایک اسلامی مملکت کا شعار نہیں۔ جب کسی قوم پر جنگ کے بادل منڈلانے لگتے ہیں تو باضابطہ فوج ایک تربیت کے مرکز کا کام دیتی ہے اور لڑنے والے

فوجی نظام سپاہی اس وقت بھی وہی ہوتے ہیں جو عام حالات میں شہری کہلاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ باضابطہ فوج کا نظام بعد کی پیداوار ہے۔ قرونِ اولیٰ میں مملکت کا ہر مسلمان سپاہی ہوتا تھا جنگ کا نقارہ بجتے ہی وہ شمشیر بکف میدان میں پہنچ جاتا تھا اور جنگ ختم ہوتے ہی ایک عام شہری کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا اور ملک کی پیداوار بڑھانے میں برابر کا شریک ہوتا تھا موجودہ دور کی طرح نہیں کہ ملک کی آمدنی کا بیشتر حصہ تو ان پر خرچ ہو لیکن ملک کی پیداوار میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔ میرا اس سے یہ مقصد نہیں کہ موجودہ زمانے میں باضابطہ مستقل فوج کی ضرورت نہیں یقیناً ہے۔ کیونکہ فنونِ جنگ آج ایک مستقل سائنس بن چکے ہیں۔ جس نقطہ پر میں زور دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت کا ہر فرد سپاہی ہوتا ہے جو ہر ہنگامی ضرورت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے عسکری تربیت کے بغیر قوم میں ڈسپلن پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ڈسپلن نہ ہو مورال بلند نہیں ہوتا۔ اور کسی قوم کی کامیابی کا دارومدار اس کے مورال اور ڈسپلن کی نسبت سے ہوتی ہے۔ یاد رکھیے کہ قوموں کی زندگی میں جب جنگ و جدل کے کٹھن مرحلے آتے ہیں تو تیاری کی مہلت نہیں دیا کرتے جو قوم عسکری زندگی سے ناآشنا ہو اسے بوقت ضرورت عسکری نہیں بنایا جا سکتا۔ ہندوستان کی مثال ساری دنیا کے سامنے ہے۔ آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے اس عظیم ملک کو جب ایک کٹھن آزمائش سے دوچار ہونا پڑا تو عسکریت کے فقدان کے باعث اسے جو خفت اٹھانی پڑی اس کے محرکات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ ملک مغربی طاقتوں سے کتنی بھی امداد کیوں نہ حاصل کر لے۔ اور اس کی فوج کی تعداد میں کتنا بھی اضافہ کیوں نہ ہو جائے عدم عسکریت کی بنا پر وہاں جو قومی مورال میں انحطاط پیدا ہو چکا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں جب بھی اس ملک کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے میدانِ جنگ میں شکست کھا جائے گا لیکن کیا ہماری حالت اس سے مختلف ہے؟ ہمارا نوجوان عسکری بننے کی بجائے فسق و فجور میں کھویا جا رہا ہے۔ طاؤس و رباب سے لگاؤ دن بدن ترقی پر ہے۔ عریب سینما ہال اور متمول ڈانسنگ ہال کی رونق بڑھتا جا رہا ہے۔ تلوار کی جھنکار کی جگہ طبلے کی تھاپ نے لے لی ہے ڈرامہ

اور جشنوں کا ذکر تو ہر روز آ رہا ہے لیکن کسی رائفل کلب کا ذکر کبھی نہیں آتا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ قوم کے لئے تفریح کا سامان نہیں ہونا چاہیئے ضرور ہونا چاہیئے لیکن تفریح اس کو زیب دیتی ہے جو کام سے تھک کر تھوڑے سے وقت کے لئے سستانا چاہے تفریح وہی صحیح تفریح ہے جو سپاہی کی تھکان دور کر کے اسے نئی قوتیں عطا کرے نہ وہ تفریح جو انسان کی رہی سہی قوت بھی سلب کر لے۔ ہمارے ہاں اس وقت یہی ہو رہا ہے اور اس سے پنڈت نہرو خوش ہے کہ پاکستانی قوم کا رجحان پستی کی طرف ہے۔ پنڈت نہرو خوش ہے کہ کشمیر اس کے ہاتھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ پنڈت نہرو خوش ہے کہ دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔

ان حالات کے ماتحت نہرو کے اس دعوے کو کہ دو قومی نظریہ غلط ہے۔ جھٹلانا آسان کام نہیں۔ پہلے خواص اور پھر عوام کے ذہن میں اللہ کی حکومت کا ایک واضح اور متعین تصور موجود ہو پھر اس پر یقین کامل ہو پھر عمل ہو تب جا کر اسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔

عملی اقدام

یہ چند ایک گزارشات جو میں نے پیش کی ہیں ان پر نہ صرف یہ کہ غور کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ایک عملی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی قومی بقا کی خاطر دو قومی نظریہ کو سچ ثابت کر دکھائیں آج ملک کے سیاسی لیڈر اپنی چودھراہٹ بحال کرنے کے لئے پھرتے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور مختلف نعرے لگا رہے ہیں اور ان کا سب سے بڑا نعرہ یہ ہے کہ جمہوریت کو بحال کیا جائے لیکن کیا ۱۹۵۸ء سے پہلے کی جمہوریت کی بحالی سے قوم کی حالت بدل جائے گی؟ کیا اس سے دو قومی نظریہ سچ ثابت ہو جائے گا۔ مسئلہ جمہوریت کی بحالی کا نہیں۔ مسئلہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کو برسر اقتدار لانے کا بھی نہیں بلکہ اصل مسئلہ آج یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کو پاکستان میں عملی طور پر متشکل کیا جائے جب ہم یہ کریں گے تو ہر چیز اپنے اپنے صحیح مقام پر آ جائے گی۔ چنانچہ اشد ضروری ہے کہ ملک کے اہل فکر اصحاب سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اس انتہائی اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لئے تدابیر سوچیں۔ اس کے لئے لائحہ عمل تیار کریں عوام کو ساتھ لیں اور اسے عملی شکل دینے کے لئے پھر اسی جوش و خروش سے اٹھیں جس طرح ۱۹۴۷ء سے پہلے اٹھے تھے۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ صدر ایوب کے خلوص اور انتھک کوششوں سے کسی کو انکار نہیں لیکن وہ جدوجہد جو منزل کی طرف قدم نہ بڑھائے نتائج کے اعتبار سے دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی جس طرح انھوں نے دوسرے مسائل کو منصوبہ بندی سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اے کاش! اگر اس بنیادی مسئلہ کے حل کے لئے بھی کوئی پانچ سالہ یا دس سالہ منصوبہ بنایا ہوتا۔ تاکہ قوم کسی وقت یہ بھی جائزہ لے سکتی کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ ایک مرتبہ اللہ کی حکومت قائم ہو جائے تو پھر اقتدار کی دوڑ بھی ختم ہو جائے گی کیونکہ مملکت سنبھالنے کی ذمہ داری اتنی بڑی ہو جائے گی کہ لوگ اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھیں گے بلکہ عوام ایسے لوگوں کو آگے آنے پر مجبور کریں گے جو حقیقتاً اس کی اہلیت رکھتے ہوں لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ مملکت حکومت خداوندی کا نقشہ پیش کرے طول و عرض میں ایسا نقشہ قائم ہو جس میں

(۱) حکومت اللہ کی کتاب ہو۔

(۲) جہاں معاملات کے فیصلے اللہ کی کتاب کے مطابق ہوں۔

(۳) جہاں ہر انسان انسان ہونے کی حیثیت سے عزت کا مستحق ہو۔

(۴) ۔ جہاں مدارج کا معیار کردار کی بلندی اور حسنِ عمل ہو۔

(۵) ۔ جہاں مملکت افراد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ دار ہو۔

(۶) ۔ جہاں عدل اور احسان کا بول بالا ہو۔

(۷) ۔ جہاں افرادِ مملکت تسخیرِ کائنات میں امام کی حیثیت رکھتے ہوں۔

(۸) ۔ جہاں اللہ کا قانون حکماً نافذ کیا جائے۔

(۹) ۔ اور جہاں قوم کا ہر فرد سپاہی ہو۔

یہ ہے وہ نقشہ جسے دیکھنے کے بعد دنیا پکار اٹھے گی کہ یہ قوم واقعی دیگر اقوامِ عالم سے الگ ہے اور اس نقشے کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کیلئے اسے واقعی ایک آزاد مملکت کی ضرورت تھی۔ اس سے ہم یہ بھی ثابت کر سکیں گے کہ قرآن فی الواقعہ وہ نظامِ زندگی عطا کرتا ہے جس میں انسانیت کی مشکلات کا حل پوشیدہ ہے اس نظام کے عملی نتائج دیکھ کر دنیا فوج در فوج اس کی طرف کھنچی چلی آئے گی یہی وہ نقشہ ہے جو روس اور امریکہ کی کش مکش کو ختم کر کے نوعِ انسان کو اس مستقل خوف سے نجات دیگا جس سے اس وقت ہر فرد پریشان اور بدحواس ہو رہا ہے اسی نقشہ میں عالمِ اسلام کے پھر سے ایک وحدت بننے کا راز مضمر ہے یہی نقشہ ہمیں اقوامِ عالم کی امامت کا مستحق بنا سکے گا۔ اس سے ہم کشمیر کیا (بوقتِ ضرورت) لال قلعہ دہلی پر اپنا پرچم لہرا سکیں گے جس طرح حضور نے مدینہ منورہ میں اللہ کی حکومت قائم کرنے کے بعد مکہ معظمہ میں لہرایا تھا۔

ورنہ یاد رکھئے باطل کی قوتیں سر پہ کھڑی ہیں جو کبھی نہرو کے اس چیلنج کی شکل میں نمودار ہوتی کہ دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے اور کبھی راجہ محمود آباد کے اس اعلان کی شکل میں کہ خود قائد اعظم محمد علی جناح کے ذہن میں لا دینی ریاست کا تصور تھا۔ زمانے کے تقاضے ہمارے بالمقابل کھڑے ہیں اور اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے ہم نے لا الٰہ الا اللہ کے نام پر اللہ سے ایک مملکت مانگی تھی سو اس نے دے دی۔ اور یہ کہکر دے دی کہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو اب اگر ہم اپنا وعدہ وفا نہیں کرتے تو اس میں اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ بگاڑ ہمارا اپنا ہی ہے۔ ہمارا مستقبل ہمارے اختیار و ارادے پر موقوف ہے اگر ہم آنکھیں کھول کر چلیں تو اللہ کی کتاب ہر وقت رہنمائی کے لئے موجود ہے اور اگر اندھوں کی طرح چلیں تو وہ ہماری جگہ کوئی دوسری قوم لا کھڑی کرے گا۔ جو ہم سے بہتر ہوگی۔

اس کا فیصلہ ہے کہ

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۔ (۴۷/۳۸)۔

اگر تم ہمارے قانونِ حیات سے روگردانی کرو گے تو ہم تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئیں گے جو تمہاری طرح نہیں ہوگی۔

دُنیا میں جنّتی زِندگی

(خان عبدالحکیم خاں کا خطاب جو انھوں نے ۱۲ اپریل کی شب کو طلوعِ اسلام کنونشن میں کیا۔)

محترم علامہ پرویز صاحب کی تصانیف میں قرآن کریم کی آیات جہاں جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ کا جملہ آجائے تو علامہ صاحب بعض مقامات پر اس کا ترجمہ "دنیا کی خوش گوار زندگی" بھی کیا کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ اگرچہ نہایت مناسب اور موزوں ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ حضرات جن کو محترم علامہ صاحب سے خداواسطے کا بیر ہے وہ اس موقع پر کہاں خاموش بیٹھ رہ سکتے ہیں، جھٹ سرخ پنسل سے نیچے لکیر کھینچ کر اخباروں، رسالوں، منبر اور اسٹیج پر اس ترجمہ اور مفہوم کا تمسخر اڑانے لگ جاتے ہیں کہ دیکھو جنّٰتٍ تَجْرِیْ کا تعلق اُخروی زندگی سے ہے لیکن پرویز صاحب اسے اس زندگی پر چسپاں کر رہے ہیں۔ یہی تو کفر کے کلمات ہیں نا۔

مجھے بھی ایک صاحب سے ایک دن اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ مفہوم القرآن کا ساتواں پارہ جب شائع ہو کر میرے پاس پہنچا تو میں نے اپنے ایک دوست کو جو ماشاء اللہ علمی اور ادبی مذاق رکھتے ہیں مطالعہ کے لئے پیش کیا۔ پہلا صفحہ ہی زیرِ مطالعہ تھا جہاں علامہ صاحب نے آیت فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ؁ کا ترجمہ کیا ہے۔ "یہ لوگ اس طرح جماعتِ مومنین میں شامل ہو گئے اور اپنے حسن کارانہ عمل کی وجہ سے زندگی کی ان خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو گئے۔ جن پر کبھی افسردگی نہیں آ سکتی۔ یہ ان کے ایمان و عمل کا بدلہ ہے" مفہوم القرآن ہاتھ میں لئے فوراً میرے پاس پہنچے اور فرمانے لگے کہ مولوی صاحبان اس لئے تو ان کے خلاف ہیں کہ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے معنی "خوش گوار زندگی" کے کئے جا رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کلمات صرف اُخروی جنت کے لئے استعمال کئے ہیں۔ میں نے اس وقت ان سے کہا کہ اس قسم کے مضمون ایک نہیں، دو نہیں، دس نہیں بلکہ بیسیوں کی تعداد میں پیش کروں گا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے میں نے قرآن کریم سے پوچھا قرآن کریم نے اپنے ارشاد کہ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) کے مطابق میری مکمل راہنمائی کی۔ جوں جوں میں قرآن کریم دیکھتا چلا گیا یہ حقیقت

سامنے آ رہی جس طرح جنتی زندگی مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے تابعدار بندوں کو بطور نعمت پیش کرنے کا عہد کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے تابعدار بندوں کے لئے اس دنیا میں بھی جنتی زندگی کا وعدہ کیا ہے۔ اور کئی ایک مقامات تو ایسے ہیں جہاں دنیاوی جنت کا اس صراحت سے ذکر کیا گیا ہے کہ سوائے ان معنی کے اس کے دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے ہیں۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زندگی کی خوشگواریوں کے لئے قرآن کریم جنت کے لفظ کے علاوہ کئی مقامات پر جنت کے لفظ کا ذکر کئے بغیر ایسے پیرائے میں اس دنیا کی نعمتوں اور خوشگواریوں کا اپنے تابع فرمان بندوں کو عطا کرنے کا تذکرہ کیا ہے کہ جنتی زندگی اس میں از خود شامل ہو جاتی ہے مثلاً سورۃ الانبیاء میں اللہ تعالیٰ اپنے تابعدار بندوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے
وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ (۲۱/۱۰۵)
اور ہم نے زبور میں اور اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں اور اب اس قرآن میں اپنا یہ اصول صاف اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ملک کے وارث میرے وہ بندے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کو مکمل طور پر اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔ اور یہی لوگ امامت کے اہل ہیں، دوسری جگہ انہیں لوگوں پر امامت اور دنیا کے نظم و نسق کی ذمہ داری ڈال کر ارشاد ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اے جماعت مومنین! تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ نے یہ کام لگا رکھا ہے کہ تم ایسا نظام قائم کرو جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع بخش ہو۔ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۳/۱۰۹) (آل عمران) اس کے لئے ضروری ہے کہ تم ان باتوں کا حکم دو جسے قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے۔ اور ان سے روکو جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں لیکن تم دوسروں سے یہ کچھ اسی صورت میں کرا سکتے ہو جب تم خود ان قوانین کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھو۔ سورۃ بقرہ میں ایک مقام پر مومنین کی شان و جلال کا حال اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے مومنین سے خطاب ہے وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا۔ اے جماعت مومنین! ہمارا مقصد یہ ہے کہ تمہیں ایک ایسی قوم بنا دیا جائے جسے تمام دنیا میں ایک بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلہ پر ہو وہ نہ کسی طرف جھکی ہوئی ہو نہ کسی سے کھچی ہوئی لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ اور اس کا فریضۂ زندگی یہ ہو کہ وہ تمام اقوام عالم کے اعمال کی محاسب و نگران ہو یعنی وہ دیکھے کہ دنیا کی کوئی قوم دوسری قوم پر کوئی زیادتی تو نہیں کرتی ہے۔ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳) اور ان کے اپنے اعمال کا محاسب و نگران رسولؐ کی حیات مبارک میں بذات خود رسولؐ ہو اور ان کی وفات کے بعد ان کے اعمال حضورؐ کے پیش کردہ قوانین الٰہی یعنی قرآن کریم کے مطابق ہوں۔

اس ضمن میں میں قرآن کریم کی وہ آیت جو ہم ہر نماز میں کئی بار دہراتے اور دعا مانگتے رہتے ہیں کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ (۲/۲۰۱) (البقرہ) بھی قابل غور ہے ہم دعا مانگتے ہیں کہ ہمیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں حَسَنَةً یعنی ایسی خوشگوار اور خوشحال زندگی جس میں کسی قسم کی کمی نہ ہو بھی حاصل ہوں اور اخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔ اور ہم ہر قسم کی مصیبتوں سے محفوظ رہیں اور ایسی زندگی اگر

جنتی زندگی نہ ہو تو اور کونسی ہوگی۔

قرآن کریم نے اپنے تابعدار بندوں کے لئے کئی مقامات پر اسی دنیا میں خوف و حزن سے نجات کا وعدہ کیا ہے پہلے ہی پہلے میں اولادِ آدم یعنی نوعِ انسان کو سمجھایا گیا کہ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) اور یاد رکھو جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی سو جو لوگ ہدایت کی اتباع کریں گے تو انہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن۔ خوف کے بنیادی معنے ہیں عام پریشانی اور گھبراہٹ، اور حزن کے بنیادی معنے ہیں سامانِ معاش کی طرف سے پریشانی۔ آپ سوچئے کہ جو معاشرہ خوف و حزن سے پاک ہو تو اس کی یہ زندگی جنتی نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ دوسرے مقام پر سورۂ طٰہٰ میں الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ——— ۵ اگر تم اپنی زندگی کو وحی الٰہی کے تابع لے آؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ بے راہ روی ہوگی اور نہ رزق کی تنگی ہوگی ——— جس کی وجہ سے تو جگر پاش مشقتوں میں پڑ جائے گا۔

خدا کا یہ قانون جیسا عرض کیا گیا ہے کہ حکومت، سلطنت، غلبہ و اقتدار اور خوشگوار زندگی صلاحیتوں کے پیدا کرنے اور نیک سعی و عمل سے حاصل ہوتی ہے بنی اسرائیل کے متعلق قرآن کریم کی ایک آیت سے بہت نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ارشاد ہے وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا اور دیکھو ہم نے اس طرح اس قوم کو جو دنیا میں نہایت کمزور اور حقیر شمار کی جاتی تھی اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا جو اپنے اندر سامانِ پرورش کی فراوانیاں رکھتی تھی۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ (۷/۱۳۷) اور اس طرح خدا کا قانونِ حسن کارانہ انداز سے قوم بنی اسرائیل کے حق میں ان کے استقلال اور استقامت کی وجہ سے پورا ہوا اور فرعون اور اس کی قوم کی فلک بوس عمارات سب درہم برہم ہوگئیں۔

قرآن کریم اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قوانین پر یقین اور ایمان رکھنے والوں کو خوشخبری دیتا ہے لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۱۰/۶۴)، جس کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں خوش خبری دے دے اس کی جنتی زندگی میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کے لئے خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۲/۸۵)، ہے یعنی اس دنیا میں انتہائی رسوائی کی زندگی ہے۔ اس رسوائی کی تفصیل کیا ہے۔ بھوک اور خوف کا عذاب اور رزق کی تنگی۔ پس اس قوم کے جرائم کی پاداش میں اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کا مزہ چکھا دیا۔ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۶/۱۱۲) (النحل)۔

ایک دوسرے مقام پر سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ اپنے تابعدار بندوں کے بارے میں فرماتا ہے وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم (۵/۶۶)،

اگر یہ اہل کتاب تورات اور انجیل کی حقیقی کتاب پر کاربند ہوتے تو ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھل جاتے اور ہر مقام سے رزق کے سرچشمے اُبلتے جاتے۔ اس کے برعکس دوسرے مقام پر سورۃ الانعام میں نافرمان بندوں کے بارے میں قریب قریب وہی الفاظ دہرا کر قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ۔ (۶/۶۵) تمہاری نافرمانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا محکم اور قوی قانون تم پر زمین و آسمان کے آفات کے دروازے بھی کھول سکتا ہے اور تمہیں نیست و نابود کر سکتا ہے۔ یہاں آپ نے دیکھا دونوں آیتوں میں "فَوْقِ" اور "اَرْجُلِ" کے الفاظ آئے ہیں لیکن پہلی آیت میں یہی الفاظ دنیاوی خوشگواریوں اور برکات پر دوش (؟) تجربوں کے حامل ہیں لیکن دوسری آیت میں یہی دو الفاظ "فوق" اور "ارجل" سرکش اور نافرمان بندوں کے لئے ہلاکت اور تباہی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

قرآن کریم آیات ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں دو چار آیتوں سے یہ بات صاف ہو گئی ہو گی کہ اللہ کے تابعدار اور غیر تابعدار انسان کی جنتی زندگی اور دوزخی زندگی یہیں دنیا میں شروع ہوتی ہے اور قوانین خداوندی کی فرماں برداری یا نافرمانی کے تحت بدلتی رہتی ہے۔

اب میں اپنے مقصد کی طرف آتا ہوں اور قرآن کریم کی دو چار آیات پر اکتفا کر کے وہ مقامات پیش کرتا ہوں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے تابعدار بندے کے لئے اخروی زندگی میں جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے وعدے کئے ہیں وہاں اسی طرح اپنے نیک اور مومن بندوں کے لئے اس دنیا میں بھی جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کی بشارت دی ہے۔

سب سے پہلے اس ضمن میں جو آیت میرے سامنے آئی ہے وہ اس تنازعہ کا فیصلہ ایسے دو ٹوک انداز سے کرتی ہے کہ کسی آدمی کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا ہے اگر قرآن کریم میں صرف یہی ایک آیت بھی موجود ہوتی تو مضمون زیر بحث پر مکمل روشنی پڑتی۔ قرآن کریم اپنا نظام پیش کرنے اور اس کے مفید نتائج کی گارنٹی کی یقین دہانی کی غرض سے سابقہ انبیاءؑ اور سابقہ اقوام کا حال بطور مثال پیش کیا کرتا ہے تاکہ قرآن کریم کے مخاطبین اس سے سبق حاصل کریں۔ اللہ تبارک کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق زندگی گزاریں اور انعام و اکرام کے مستحق ٹھہرائے جائیں۔ چنانچہ یہاں بھی بنی اسرائیل کے ذکر میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ بنی اسرائیل کی زندگی شہادت تمہارے سامنے ہے ان سے بھی اس نظام کے قیام کا عہد لیا گیا تھا وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا۔ ان کے بارہ قبائل تھے اور تنظیم کی غرض سے ہر قبیلہ کا ایک نقیب تھا جو ان کے حالات کی خبر گیری کرتا تھا۔ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ۔ ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ ہماری تائید و نصرت تمہیں نصیب ہو گی اگر تم نے نظام صلوٰۃ کو قائم کیا اور نوع انسان کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتے رہے وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ۔ اور ہماری طرف سے بھیجے ہوئے رسولوں کو سچا مانتے رہے۔ اور اس مشن اور پروگرام کی تعمیم کرتے ہوئے ان کے رفیق اور مددگار بنتے رہے۔ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ اور نوع انسان کی مرفہ الحالی کے لئے

اپنا سرمایہ خرچ کرتے ہو۔ لَأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جائینگی۔ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ اور تمہیں خوش حالی اور آسودگی کی ایسی جنتی زندگی (اس دنیا میں) نصیب ہو جائے گی جس کی شادابی اور تازگی ہمیشہ رہے گی (اس دنیا میں)۔ اس دنیا میں اس لئے کہ آگے ارشاد ہے فَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝ —— (۵/۱۲) لیکن جو اس روش پر چلنے کے بعد پھر انکار اور سرکشی کا راستہ اختیار کرے گا تو زندگی کی ہموار راہیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی۔ اور وہ اپنی منزلِ مقصود سے بہت دور جا پڑے گا۔ یہاں داخلۂ جنت کے بعد فَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ۔ کا ٹکڑا اس طرح اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اس کا اخروی جنت کے ساتھ کوئی تعلق ہے ہی نہیں، کیونکہ اخروی جنت میں ایک دفعہ داخل ہونے کے بعد تو پھر کفر و انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ سے مطلب لامحالہ اس زندگی کی جنت سے ہے ہاں اگر کسی وقت بھی فَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ یعنی کفر و انکار کی زندگی اختیار کی گئی تو اس سے یہ جنتی اور خوش گوار زندگی چھین لی جائے گی اور دوسری قوم کو مرحمت کی جائے گی اور پھر وہ دوسری قوم ہرگز ویسی نہ ہو گی۔ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (۴۷/۳۸۔ محمد)۔

سورۂ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کے تذکارِ جلیلہ میں قرآن کریم ان کی زبانی فرماتا ہے کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو رات دن آپ کے احکام کی طرف بلایا ان کو برسرِ عام جلسوں میں اور ایک ایک کر کے یعنی فرداً فرداً بھی سمجھایا لیکن وہ مجھ سے دور بھاگتے رہے میں نے اپنی قوم کو یہاں تک کہہ دیا کہ تم لوگوں نے اب تک جو غلط کام کئے ہیں ان پر اب بھی پشیمان ہو جاؤ تو میرا رب تم کو خود اپنی حفاظت میں لے لے گا۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ۔ بیشک اللہ تعالیٰ سابقہ غلط کاریوں کو معاف کرنے والا ہے اور وہ سب سے بڑا محافظ ہے إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا۔ اور جب تمہیں معاف کر کے اپنی حفاظت میں لے لیگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں گوناگوں نعمتوں سے مالا مال کرے گا مثلاً وہ تم پر مینہ برسانے والا بادل بھیجے گا۔ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا مال و دولت اور آل و اولاد عطا کرے گا۔ وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ۔ اور اس کے بعد دنیا ہی جنت کا وعدہ کیا گیا۔ یعنی تمہیں اس دنیا میں ایسی جنتیں عطا کی جائیں گی کہ ان کی شادابی اور سرسبزی ان میں جاری شدہ نہروں کے سبب سے دائم اور قائم رہے گی۔ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا ۝ پھر عجیب بات ہے کہ اتنے انعام و اکرام دینے والے خدا کی محکومیت اور تابعداری کو تم کیوں قبول نہیں کرتے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسے اللہ کو قابلِ احترام و قابلِ قدر ہستی نہیں سمجھتے ہو۔ مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۝ (۷۱/۱۳)۔

دوسرے مقام پر سورۃ (الدخان) میں فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں جب فرعون کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو اس عیش و آرام کی زندگی کی قدر اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے محکومیت اور عبودیت کی شکل میں نہ کی جو اُسے دی گئی تھی تو آخر کار مہلت کا زمانہ ختم ہو گیا اور نتائج آخری نکلنے تک مرتب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۔ راتوں رات میرے بندوں کو یہاں سے نکال لے جا لیکن خیال رہے کہ ایسے نہیں چھوڑے جاؤ گے بلکہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا اس لئے وَاتْرُکِ الْبَحْرَ رَھْوًا ۔ تم سمندر کے راستے کو چھوڑ کر خشکی کا راستہ اختیار کر لو۔ اِنَّھُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۔ اور یاد رکھو یہ جو تمہارا تعاقب کرنے والے ہیں یہ غرق ہو جائیں گے۔ کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۔ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ ۔ وَّنَعْمَۃٍ کَانُوْا فِیْھَا فٰکِھِیْنَ ۔ اور دیکھو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی نعمتوں سے کس طرح نوازا تھا۔ ان کو عمدہ عمدہ باغات دیئے گئے تھے۔ سرسبز اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے مالک بنائے گئے تھے جن میں زندگی بخش چشموں کا پانی ہر وقت رواں دواں تھا اور ان کے رہنے سہنے کے لئے عالیشان محلات تھے جن میں وہ باعزت اور باوقار زندگی بسر کیا کرتے تھے لیکن عزت اور شان و شوکت کا یہ سب ساز و سامان ان سے چھین لیا گیا کَذٰلِکَ وَاَوْرَثْنٰھَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ (۲۸)

اور یہی میرا قانون اور طریقہ ہے کہ سرکش اور بدمست قوم کو میں اپنی نعمتوں سے محروم کرتا ہوں اور ان کے سامان و متاع اور نعمتوں کو اپنے تابعدار بندوں کے قبضہ میں دیا کرتا ہوں۔ میرا قانون، قوم کے روزانہ عمل سے نتائج مرتب کرتا رہتا ہے میرے قانون میں بغیر عمل کوئی قوم میری لاڈلی نہیں ہے۔ لاڈلی وہ ہے جو باعمل قوم ہو میرا قانون فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ــــــــ (۹۹) کے مطابق کارفرما ہے۔ مسلمان قوم بھی اگر عملاً مسلمان نہیں تو وہ صرف اپنا نام مسلمان رکھنے سے میرے قانون مکافات سے نہیں بچ سکتی۔ وہ اگر صرف اپنا نام مسلمان رکھنے سے میرے انعام و اکرام کی متمنی رہتی ہے تو یہ اس کی بھول ہے معلوم ہوتا ہے اس کو میرے قانون کا علم نہیں۔

ملک سبا اور ملکہ سبا سے قرآن بین حضرات ناواقف نہیں ہیں ان کے حالات تفصیل کے ساتھ قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں۔ قرآن کریم اپنے مطالب کبھی قصے کے رنگ اور کبھی تمثیلی رنگ میں ہمارے لئے درس عبرت کے طور پر بیان فرماتا ہے۔ سورۃ سبا میں بھی اس دنیاوی جنت کا ذکر بہت نمایاں طور پر آیا ہے ارشاد ہے۔ لَقَدْ کَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْکَنِھِمْ اٰیَۃٌ " سبا کے لوگوں کے لئے اپنے ہی ملک میں عبرت حاصل کرنے کے لئے نشان موجود ہیں ان کو دور جانے کی ضرورت نہیں۔ جَنَّتٰنِ عَنْ یَّمِیْنٍ وَّشِمَالٍ ۔ وہ نشان اور عبرت کا مقام کیا تھا؟ وہ دائیں اور بائیں دو وسیع، سرسبز و شاداب باغ تھے۔ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّکُمْ وَاشْکُرُوْا لَہٗ ۔ یہ باغ بزبان حال پکار رہے تھے کہ اپنے ربوبیت کرنے والے کے دئے ہوئے رزق سے خود بھی کھایا کرو اور زائد از ضرورت حاجت مندوں کو بھی دیا کرو (خیال رہے کہ یہاں وَاشْکُرُوْا لَہٗ کے معنی شکریہ ادا کرتے رہو۔ شکریہ کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پیٹ بھر کھانے کے بعد پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے "شکر الحمد للہ" پڑھنا شروع کرے بلکہ اپنے ربوبیت کرنے والے کا عملاً شکر ادا کرنا ہے۔ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا " عملاً شکریہ کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین و احکام کا ہر گھڑی پابند رہنا اور اپنی ضرورت

زائد رزق کو ضرورت مندوں میں تقسیم کرنا بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ۔ ان باغات کی وجہ سے یہ ایک خوشحال اور مثالی شہر تھا۔ اہل شہر کو ہر قسم کا آرام وسکون نصیب تھا۔ وَرَبٌّ غَفُورٌ۔ ان کا ربوبیت کرنے والا خدا نہ صرف ان کو افراط سے رزق دیا کرتا تھا بلکہ غفور بھی تھا یعنی مصائب وآلام سے ان کی حفاظت بھی کیا کرتا تھا۔ یہ تو تھا اس وقت کا نقشہ جب یہ لوگ اللہ کے قوانین کے پابند اور عملاً شکرگذار تھے لیکن اس کے بعد وہ بدل گئے انہوں نے کیا کیا فَأَعْرَضُوا۔ انہوں نے اعراض کیا۔ میرے قوانین سے منہ موڑا۔ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ ... یعنی ہم تو ہم نے ان پر زور کا سیلاب بھیجا اور ان کے ــــــ بند وغیرہ سب کے سب اس کی نذر ہو گئے وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ۔ اور اس کے بعد ہم نے ان کے سرسبز وشاداب دونوں باغ ایسے دو باغوں میں جو ذَوَاتَىْ أُكُلٍ خَمْطٍ تھے یعنی جن کے میوے بدمزہ بدذائقہ اور تلخ تھے۔ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ۔ اور جن میں جھاؤ کے درخت اور کچھ برائے نام بیری کے درخت کے علاوہ کوئی دوسری چیز اگتی ہی نہ تھی ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا۔ ان کی یہ حالت اس وجہ سے ہو گئی کہ انہوں نے ہمارے قوانین سے سرکشی کی اور کفران نعمت کا شیوہ اختیار کیا وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ۔ (۳۴/۱۷) اور یہ ہمارا قانون ہے کہ ہم ناشکروں اور اپنے قوانین سے سرکشوں کے سوا کسی کو مصیبت میں نہیں ڈالا کرتے ہیں۔

آپ دیکھئے ہمارے ہاں ہر سال سیلاب آتے ہیں یہ نتیجہ ہے ہمارے کفرانِ نعمت کا اور قوانین خداوندی سے سرکشی کا۔ ہم اللہ کے کسی ایک قانون کی بھی پابندی نہیں کرتے ہیں ان دریاؤں پر بند باندھنے اور ان کے تہہ (BEDS) کی صفائی کے لئے مثلاً ایک لاکھ روپے منظور کئے جاتے ہیں تو ان میں سے بلا مبالغہ پچھتر ہزار روپے محکمے کے ارباب بست وکشاد اور ٹھیکہ دار خورد برد کر لیتے ہیں۔ اور پچیس ہزار روپے کام پر خرچ کئے جاتے ہیں کیا اس طرح خورد برد کرنے والے اور خیانت کرنے والے ناشکرے افراد جو بند سیلاب کے روکنے کے لئے تعمیر کریں گے وہ کام دے سکیں گے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جوں ہی معمول سے بارش کچھ زیادہ ہو جائے سیلاب کی تباہ کاریاں ہر سو پھیل جاتی ہیں۔

مندرجہ بالا چند آیات سے آپ حضرات نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مومن اور تابعدار بندے کے لئے جس طرح اللہ تعالیٰ نے آخرت میں جنت، انہار، چشموں کا وعدہ کیا ہے اور خوف وحزن سے پاک زندگی کی خوش خبری دی ہے اسی طرح اس دنیا میں بھی ایک مومن، تابعدار اور خدا کے قوانین کی فرمانبردار قوم کے لئے وہی جنت وانہار وہی انعام واکرام اور وہی خوش گوار ومرفہ الحال زندگی کے وعدے قرآن کریم میں موجود ہیں۔ ہم اس کے ملنے کے لئے اس لئے تیار نہیں کہ ہمیں اس دنیا میں اس میں ـــــ حاصل تو کوئی چیز ہے نہیں اور ما شاء اللہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے بزعم خود اس کا حقدار بھی سمجھتے ہیں تو عافیت اس میں نظر آنے لگی کہ اس دنیا پر لعنت بھیجی جائے اور سب انعامات اخروی زندگی کے سپرد کئے جائیں۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مودودی صاحب کے فتوے کے مطابق مسلمان اس دنیا میں مصیبت زدہ، ذلیل اور خوار رہیں۔ اخروی زندگی کی عیش وعشرت، آرام وسکون اور انعام واکرام حاصل کرنے کا

حق دار ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ نظریہ قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے اور علامہ پرویز صاحب قرآنی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ جو ان لوگوں کے خلاف جاتا ہے اس لئے یہ حضرات سرے سے مومن کے لئے دنیاوی جنت یعنی دنیاوی زندگی کی خوشگواریوں سے انکار کرنے لگ گئے لیکن قرآن کریم اس حقیقت کا بہ تکرار اظہار کرتا ہے آخر کب تک سے جھٹلایا جائے گا۔ واضح رہے کہ علامہ صاحب نہ (معاذ اللہ) حیاتِ اُخروی سے انکار کرتے ہیں اور نہ ہی وہاں کی جنت اور دوزخ سے انکار۔ وہ سیکڑوں مقامات پر اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی، اور وہاں کی جزا سزا جنت و دوزخ پر یقین جزوِ ایمان ہے اور اس ایمان کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتے صرف یہ ہیں کہ ایمان اور اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں جنتی زندگی بھی ہے اور یہی اس بات کا ٹھوس معیار ہے کہ ہمارا ایمان اور اعمال قرآن کریم کے معیار کے مطابق درست ہیں یا نہیں۔ چونکہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے پیش کردہ اسلام اپنے نتیجہ کے اعتبار سے اس معیار پر پورا نہیں اترتا اس لئے وہ بجائے اس کے کہ اپنے موقف پر تنقیدی نگاہ ڈال کر اسے قرآن کریم کے مطابق بنا لیں سرے سے اس معیار ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن نہیں سمجھتے کہ ان کے اس انکار سے نہ اعمال کی نوعیت بدل سکتی ہے نہ ان کے نتائج میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں جنتی زندگی اور آخرت کی جنتی زندگی ہے اور جو اعمال اس معیار پر پورے نہیں اُترتے وہ قرآنی نہیں کہلا سکتے۔

میں نے ایک آیت جو گزشتہ صفحات میں درج کی ہے اور جسے ہم روزانہ نمازوں کی بار بار دہراتے رہتے ہیں یہی اللہ تعالیٰ کے قانون کا تقاضا ہے۔ یہی ہماری شب و روز کی دعا ہے اور یہی ہماری زندگی کا منتہا اور مدعا ہے۔

اسے ایک بار پھر دہراتے ہوئے اسی پر اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

مفت

دوا برائے دمہ و درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ :-

شیخ آئی ایس فیکٹری

متصل گنیش کمو پراملز
لارنس روڈ — کراچی

نوٹ : جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔